ماہنامہ

اشراق

لاہور

اپریل ۲۰۲۴ء

1979 سے جاری شدہ
اشاعت کے 45 سال

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

"قرآن مجید کے ساتھ تعلق کیا ہو؟ اس پر بہت کچھ لکھا اور بولا گیا ہے۔ عام طور پر قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ناظرہ پڑھنے پر سمجھایا جاتا ہے کہ قرآن پڑھنے کا اس سے حق ادا نہیں ہوتا۔ اگرچہ ایسے علما بھی ہیں جو ناظرہ تلاوت ہی کو مرجح قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک عام آدمی اگر ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھے گا تو اپنی کم علمی کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہو گا اور فتنے میں بھی پڑ سکتا ہے، حالاں کہ عام آدمی بالعموم اپنے حدود سے آشنا ہوتا ہے اور جہاں اسے کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، وہ علما ہی سے رجوع کرتا ہے اور یہی صائب رویہ ہے۔ البتہ جو کسی زعم میں مبتلا ہو، اس کو ضرور تلقین کرنی چاہیے کہ 'ایاز قدرِ خود بشناس'۔"

—— شذرات

- اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کے لیے اپنے گناہوں سے توبہ کرنا اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی جناب میں توبہ کرنے سے جان بوجھ کر گریز سرکشی کے زمرے میں آتا ہے۔ (دین و دانش)
- اعتکاف کا مقصد یہ ہے کہ ایک شخص اِس طرح اپنی تربیت کرے کہ وہ خدا کے ساتھ جینا سیکھ لے۔ اُس کے صبح و شام یادِ الٰہی میں بسر ہونے لگیں۔ وہ تقویٰ و حسنِ اخلاق کا نمونہ ہو اور ایمان و اخلاق کے تقاضوں کے ساتھ زندگی گزارنے والا بن سکے۔ (دین و دانش)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ وتلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول وفروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق وتنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشرواشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان واخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم وتعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما وصالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر وعبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور
زیرسرپرستی
جاوید احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۶ شمارہ ۴ اپریل ۲۰۲۴ء رمضان/شوال ۱۴۴۵ھ

فہرست

شذرات

قرآن: کتاب معرفت — طالب محسن — ۴

قرآنیات

البیان: صٓ ۳۸: ۱۷-۲۹ (۲) — جاوید احمد غامدی — ۷

معارف نبوی

علامات قیامت (۷) — جاوید احمد غامدی / ڈاکٹر محمد عامر گزدر — ۱۳

دین و دانش

توبہ (۱) — محمد رفیع مفتی — ۲۳

اعتکاف کا مقصد — محمد ذکوان ندوی — ۳۳

مقالات

’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟ (۱) — ساجد حمید — ۳۸

شخصیات

حیات امین احسن (۷) — محمد بلال — ۴۸

نقطۂ نظر

بطور غیر مسلم اقلیت قادیانیوں کے مذہبی حقوق کا مسئلہ — ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر — ۵۴

سیر و سوانح

حضرت اسماء بنت مخرّبہ رضی اللہ عنہا / حضرت سلمیٰ بنت صخر رضی اللہ عنہا — محمد وسیم اختر مفتی — ۶۱

اصلاح و دعوت

حضرت لوط کی قوم پر عذاب کیوں؟ — کوکب شہزاد — ۶۹

یسئلون

خدا اور الحاد — معاذ بن نور — ۷۴

رمضان کے اثرات / علما اور عید کا تعین — شاہد رضا — ۸۰

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد | محمد رفیع مفتی
طالب محسن | محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن | ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم | آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر | خورشید احمد ندیم
اظہار احمد | کوکب شہزاد
جنید حسن | مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

طالب محسن

قرآن: کتاب معرفت

قرآن مجید کے ساتھ تعلق کیا ہو؟ اس پر بہت کچھ لکھا اور بولا گیا ہے۔ عام طور پر قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ناظرہ* پڑھنے پر سمجھا یا جاتا ہے کہ قرآن پڑھنے کا اس سے حق ادا نہیں ہوتا۔ اگرچہ ایسے علما بھی ہیں جو ناظرہ تلاوت ہی کو مرجح قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک عام آدمی اگر ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھے گا تو اپنی کم علمی کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہو گا اور فتنے میں بھی پڑ سکتا ہے، حالاں کہ عام آدمی بالعموم اپنے حدود سے آشنا ہوتا ہے اور جہاں اسے کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، وہ علما ہی سے رجوع کرتا ہے اور یہی صائب رویہ ہے۔ البتہ جو کسی زعم میں مبتلا ہو، اس کو ضرور تلقین کرنی چاہیے کہ 'ایاز قدرِ خود بشناس'۔ لیکن ان معدودے چند لوگوں کی وجہ سے بڑی اکثریت کو قرآن کے مطالب سے دور رکھنا کسی طرح موزوں نہیں۔ قرآن مجید کو ترجمہ و تفسیر کے ساتھ پڑھنا ہی اولیٰ ہے۔ لیکن یہ احتیاط کرنی چاہیے کہ جو لوگ کسی معذوری کے باعث صرف ناظرہ تلاوت ہی کر سکتے ہیں، وہ ہمارے اس اصرار کے نتیجے میں کہ قرآن صرف سمجھ کر ہی پڑھنا چاہیے قرآن کے ساتھ تعلق کی کم از کم دست یاب صورت ہی سے محروم ہو جائیں، اس لیے کہ اس تعلق کے بھی کچھ ثمرات ہیں۔ لیکن جو لوگ ناظرہ پڑھنے سے آگے بڑھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، وہ اپنی محرومی کو سمجھیں اور فہم قرآن کی جو صورت ممکن ہے، اسے اختیار کریں اور اپنی اہلیت کو بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کریں۔

کم از کم ابتدا یہاں سے ہونی چاہیے کہ کسی درس قرآن کی مجلس میں شرکت کو زندگی کا لازمی حصہ بنائیں۔ مدرس کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اس شخص کا جید عالم ہونا ضروری ہے۔ معاشرے میں بالعموم یہ

---

* ناظرہ: قرآن مجید کی تلاوت جس میں صرف عبارت پڑھ لی جاتی ہے، یعنی الفاظ کی بغیر سمجھے ادائیگی۔

واضح ہی ہوتا ہے کہ کون کون سے علما بڑے اصحاب علم ہیں۔ اگرچہ عام آدمی خود صحیح اور غلط کا حکم لگانے کی قابلیت نہیں رکھتا، لیکن اگر وہ جائز تنقید کے لیے اپنے دل ودماغ کو کھلا رکھے تو اللہ کی توفیق اسے حاصل ہو گی اور اسے راہ حق تک پہنچنے میں مدد کی جائے گی۔ یہاں یہ نکتہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ صحیح رخ پر سعی وجہد انسان کے شعوری قویٰ کو بہتر بناتی اور اسے اس ذوق وشوق سے آراستہ کر دیتی ہے جو راہ ہدایت کا زاد راہ ہے۔

اگر ممکن ہو تو خود قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر کے ساتھ مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ عربی زبان سیکھنے کا موقع ہو تو اتنی عربی ضرور سیکھ لینی چاہیے کہ سادہ ترجمے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ لیکن ہر قابلیت اس بات کا امتحان ہے کہ اسے اپنے حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے۔ کوئی عالم دین ہو یا غیر عالم دین اصل مقصود خدا کی رضا کا حصول ہے، اللہ تعالیٰ کے منشا کو جاننا ہے۔ 'مخلص له الدين' بننا ہے، نہ کہ دین سازی کے فتنے میں مبتلا ہونا۔

قرآن ہمارا ایمان ہے کہ مالک کائنات کی طرف سے بھیجی گئی ہدایت ہے۔ لیکن یہ کسی ہدایت نامے کے طرز پر نہیں لکھی گئی ہے کہ ابواب قائم کر کے زندگی کے دائروں سے متعلق احکام اور ہدایات درج کر دی جائیں۔ استاذ گرامی نے اس کے لیے سرگذشت انذار کی ترکیب چنی ہے، یعنی ایک دعوت کے برپا ہونے اور اس کے اپنے اہداف تک پہنچنے کے احوال منزل بہ منزل۔

اس طرز بیان نے اس کتاب کو مرقع عجائب بنا دیا ہے۔ اپنے بھیجنے والے کا تعارف: اس کی صفات، اس کے فیصلے، اس کی حکمت عملی، اس کے اہداف اور اس کی عدالت کے اصول، غرض اس کی معرفت کے متعدد پہلو اس کے ذریعے سے جانے جا سکتے ہیں۔

اس کا انسانوں کے لیے پسند کردہ دین، یعنی اسلام: اس کے عقائد اور ان کا استدلال، اس کی شریعت اور اس کے اہداف، اس کی اخلاقیات اور اس کے مطلوب معیار، اس کا تعمیر کردہ سماج اور اس کی اقدار، غرض شریعت اور منہاج کے تمام مباحث اس میں مل جائیں گے۔

مذہب، اس کی بنیاد، اس کے اہداف، اس کے شعوری اور نفسیاتی اوضاع، اس کا سماجی کردار، دنیوی زندگی کے مختلف دائروں میں اس کی صوری اور معنوی تشکیلات، غرض 'مذہب کیا ہے' کے سوال کے جوابات اس میں مل جائیں گے۔

یہ زندگی کیا ہے؟ اس کے حوالے سے کہاں کھڑا ہونا چاہیے؟ اس کے دنیوی اہداف اور اخروی اہداف کے مابین کیا تعلق ہے، ایک خدا کے بندے کا اس دنیا کے تعلق سے کیا لائحۂ عمل ہونا چاہیے؟ غرض زندگی کا ایک مکمل تصور اس میں مل جائے گا۔

پیغمبری کیا ہے؟ کارپیغمبری کیا ہے؟اُن کی بعثت کیا معنی رکھتی ہے؟اُن کو ماننا اور اُن کو نہ ماننا کس طرح کا عمل ہے؟اُن کے آنے سے اس دنیا کے ساتھ اللہ کیا معاملہ کرتے ہیں؟ان سب سوالات کے جوابات اس کتاب سے حاصل ہوتے ہیں۔

خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟خیر کے لیے اللہ کا قانون کیا ہے اور شر کے ساتھ وہ کیا معاملہ کرتا ہے؟رزم گاہ خیر وشر کے ان رازوں سے پردہ یہی کتاب اٹھاتی ہے۔

سماج، تہذیب اور ثقافت کو اگر خیر پر استوار کرنا ہو تو اس کے عناصر کیا ہیں؟فرد کی تعمیر اگر خدا کی مرضیات کے مطابق کرنی ہو تو اس کے نشانات منزل کیا ہیں؟ان حقائق سے آگاہی کا بے خطا ماخذ یہی کتاب ہے۔

بندہ اور خدا، اِن کا تعلق کیا ہے؟ یہ تعلق کن اساسات پر استوار ہوتا ہے؟اس کی صورتیں کیا ہیں اور اس کی منزل کیا ہے؟اس میں انسانوں نے کہاں کہاں خطا کھائی ہے؟یہ باتیں جاننے کا اصل ذریعہ یہی کتاب ہے۔

ہم یا تو قرآن مجید کو عبادت کے طور پر پڑھتے ہیں کہ اس کی تلاوت سے ثواب ہوتا ہے یا اس سے دینی احکام جاننے کے لیے پڑھتے ہیں جو ہمارے دین پر عمل میں ہماری ضرورت ہے یا ہم اپنے کسی علمی یا عملی مسئلے کے جواب کی غرض سے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں۔

یہ قرآن مجید سے تعلق کی صورتیں قرآن مجید سے کماحقہٗ استفادہ نہیں ہیں۔بے شک، قرآن مجید کی تلاوت عبادت ہے۔بے شک، یہ اللہ کے احکام کے جاننے کا ذریعہ ہے۔بے شک، دین سے متعلق سوالات کے جواب جاننے کے لیے اس کی طرف رجوع ہونا چاہیے، لیکن یہ مالک کائنات کا کلام ہے۔اسے آخری کتاب کی حیثیت سے اتارا گیا ہے۔اب اسے ہی قیامت تک خدا کی طرف سے اتاری گئی ''خدا کی کتاب'' کی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا یہ کتاب حق کی معرفت کی کتاب ہے۔یہ اللہ کی معرفت کی کتاب ہے۔یہ بندگی کی معرفت کی کتاب ہے۔اس کے ساتھ جاننے کا تعلق بھی بننا چاہیے۔اس کے ساتھ اس کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا تعلق بھی بننا چاہیے۔اور پھر یہ کہ یہ جاننا اور یہ ماننا اور یہ تعمیل ارشاد مجھے وہ بنادے جو میرا رب مجھے بنانا چاہتا ہے۔میں بندگی کے تمام تقاضے پورے کردوں اور اس پر دل و جان سے راضی ہو جاؤں۔اور میرا رب بھی مجھ سے راضی ہو جائے۔خدا کی کتاب کا میرا مطالعہ بندگی کے اس مقام کو جاننے، ماننے اور اپنانے کے لیے ہونا چاہیے۔اس باب میں خدائے کائنات کی مرضیات کی واحد، صحیح ترین اور خالص ترین کتاب صرف اور صرف قرآن ہے۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ صٓ

(۲)

اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاذۡکُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ۚ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾
اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِشۡرَاقِ ﴿۱۸﴾ۙ وَالطَّیۡرَ

یہ جو کچھ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو، (اے پیغمبر)، اور بڑی قوت کے مالک، ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو۔[۱۲۷] حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔[۱۲۸] ہم نے اُس کے ساتھ پہاڑوں کو

۱۲۷۔ اِس لیے کہ خود بھی اُس کے حلم و تحمل سے تسلی حاصل کرو اور اپنے مخاطبین کو بھی توجہ دلاؤ کہ اِن سے کہیں بڑھ کر قوت و شوکت اور دولت و حشمت کا مالک ہونے کے باوجود وہ کسی غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ داؤد علیہ السلام خدا کے پیغمبر بھی تھے اور بنی اسرائیل کے عظیم بادشاہ بھی۔ ہم سورۂ سبا (۳۴) کی تفسیر میں پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ اُن کی سلطنت خلیج عقبہ سے دریاے فرات کے مغربی کناروں تک پھیلی ہوئی تھی جس پر وہ ۹۶۵ق م تک حکومت کرتے رہے۔

۱۲۸۔ یعنی زور و قوت نے اُس کے اندر رعونت پیدا نہیں کی تھی، بلکہ اُس کی خشیت و انابت کو اور بڑھا دیا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... قرآن نے یہاں ’ذَا الۡاَیۡدِ‘ اور ’اَوَّاب‘، دونوں صفتوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ کوئی صاحب قوت و حکومت شخص اللہ تعالیٰ کا منظور نظر بندہ اُس وقت بنتا ہے، جب قوت و شوکت کے ساتھ

مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾
وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى
دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ

مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام اُس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی، جھنڈ کے جھنڈ [۱۲۹] —— سب اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ ہم نے اُس کی سلطنت مضبوط کر دی تھی، اُس کو حکمت عطا کی تھی اور نزاعات میں فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی۔ ۱۷-۲۰

تمھیں اُن لوگوں کی خبر پہنچی ہے [۱۳۰] جو مقدمہ لے کر آئے تھے؟ جب وہ دیوار پھاند کر اُس کی محراب [۱۳۱] میں داخل ہو گئے، [۱۳۲] اُس وقت جب وہ داؤد کے پاس پہنچ گئے تو وہ اُن سے ڈر گیا۔

اُس کے اندر 'اوابیت' کی صفت پائی جائے۔ اگر قوت و صولت اُس کے اندر 'عزت و شقاق' کی رعونت پیدا کر دے تو یہ نمرودیت اور فرعونیت ہے جو اللہ کے نزدیک ملعون و مبغوض ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۵۲۲)

۱۲۹۔ یعنی اپنے خاص لحن میں جب وہ زبور کے منظوم نغمے چھیڑتے تو دشت و جبل، چرند و پرند، سب اُن کے ہم نوا ہو کر اُن کے شریک بزم بن جاتے تھے۔ قرآن نے دوسرے مقامات میں تصریح فرمائی ہے کہ اِس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے، لیکن انسان اُس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ تاہم حضرت داؤد کا معاملہ یہ نہیں تھا۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اللہ تعالیٰ نے جس طرح اُنھیں پہاڑوں کو موم کر دینے والا اور پرندوں کو جذب کر لینے والا سوز و لحن بخشا تھا، اُسی طرح اُن کو وہ گوش شنوا بھی عطا فرمایا تھا کہ وہ اُن کی تسبیح و مناجات کو سمجھ سکیں۔

۱۳۰۔ یہ اسلوب خطاب واقعہ کی اہمیت کو بھی ظاہر کرتا ہے اور اِس میں مخاطبین کے لیے فی الجملہ تشویق و ترغیب بھی ہے کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اُس کو سنیں۔

۱۳۱۔ یعنی داؤد علیہ السلام کی خلوت گاہ میں۔ شاہی محلات کی تعمیر میں محرابوں کی کثرت ہوتی تھی۔ اِسی سے یہ لفظ اُن کے کمروں، بر آمدوں اور نشست گاہوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ اردو زبان میں بھی اِس کا یہ استعمال معروف ہے۔

۱۳۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ'۔ اِن میں تضمین ہے، یعنی 'تَسَوَّرُوا الْجِدَارَ

فَاحۡکُمۡ بَیۡنَنَا بِالۡحَقِّ وَلَا تُشۡطِطۡ وَاہۡدِنَاۤ اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾
اِنَّ ہٰذَاۤ اَخِیۡ ۟ لَہٗ تِسۡعٌ وَّتِسۡعُوۡنَ نَعۡجَۃً وَّلِیَ نَعۡجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ۟ فَقَالَ
اَکۡفِلۡنِیۡہَا وَعَزَّنِیۡ فِی الۡخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدۡ ظَلَمَکَ بِسُؤَالِ نَعۡجَتِکَ اِلٰی

اُنھوں نے فوراً کہا کہ آپ ڈریں نہیں، ہم دو فریق معاملہ ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے، سو آپ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے اور کوئی بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں سیدھی راہ بتائیے۔[۱۳۳] ۲۱-۲۲

یہ میرا بھائی ہے۔ اِس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے۔[۱۳۴] اب یہ کہتا ہے کہ وہ بھی میرے حوالے کر دو اور اِس نے بحث میں مجھے دبا لیا ہے۔[۱۳۵] داؤد نے کہا: اِس

وَدَخَلُوا الۡمِحۡرَابَ‘۔

۱۳۳۔ آگے جو مقدمہ پیش کیا گیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ کوئی حقیقی فریق مقدمہ نہیں تھے، بلکہ ایسے لوگ تھے جو تمثیل کے اسلوب میں خود حضرت داؤد کو اُن کی کسی غلطی پر متنبہ کرنے کے لیے اِس طریقے سے اُن کے محل میں داخل ہوئے تھے۔ یہ اُن کے کوئی خیر خواہ بھی ہو سکتے ہیں اور خدا کے فرشتے بھی جو انسانی صورت میں آئے اور اُنھیں توجہ دلا کر چلے گئے۔ بائیبل سے پہلی بات کی تائید ہوتی ہے، لیکن غور کیجیے تو دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ اِس لیے کہ رعایا کے کسی فرد یا افراد کا اِس طرح دیوار پھاند کر فرماں روائے وقت کی خلوت گاہ میں جا پہنچنا آسانی کے ساتھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ تاہم اِس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کیسے خدا ترس اور متحمل مزاج بادشاہ تھے کہ اُن کی اِس حرکت پر کچھ بھی کبیدہ خاطر نہیں ہوئے، بلکہ اپنی عدل پروری کے باعث فوراً اُن کا مقدمہ سننے کے لیے تیار ہو گئے، اِس کے باوجود کہ اُن کا اسلوب گفتگو بھی، جیسا کہ ’لَا تُشۡطِطۡ‘ کے لفظ سے ظاہر ہے، کچھ ایسا شایستہ نہیں تھا۔

۱۳۴۔ اُس زمانے کے تمدن میں لوگوں کی اصل دولت بھیڑوں اور دنبیوں کے ریوڑ ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ تمثیل میں اُنھی کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۳۵۔ یعنی چونکہ دولت مند ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں، گرد و پیش کے لوگ اِسی کی حمایت کر رہے

نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ
رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴿۲۴﴾ السجدة فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

نے تمھاری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملانے کا مطالبہ کر کے یقیناً تم پر ظلم کیا ہے[۱۳۶] اور واقعہ یہ ہے کہ معاملے کے اکثر شریک اِسی طرح ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔[۱۳۷] اِس سے وہی بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں۔ اُس وقت داؤد کو خیال ہوا کہ یہ تو ہم نے اُس کا امتحان کیا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے پروردگار سے معافی چاہی اور اُس کے حضور جھک کر سجدے میں گر گیا[۱۳۸] اور (پورے دل سے اُس کی طرف) رجوع ہوا۔ تب اُس کی وہ خطا[۱۳۹] ہم نے معاف کر دی اور اُس کے لیے یقیناً ہمارے پاس تقرب کا خاص مقام اور اچھا انجام ہے۔ ۲۳-۲۵

ہیں، اِس لیے دب کر رہ گیا ہوں، بحث و جدال میں اِس سے جیتنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

۱۳۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ'۔ اِن میں لفظ 'سُؤَال' مطالبے کے مفہوم میں ہے۔ اِس مفہوم کے لیے عربی زبان میں اِس کا استعمال معروف ہے۔ اِس کے بعد 'اِلٰى' کا صلہ ہے۔ یہ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ لفظ یہاں 'ضَمّ' یا 'خَلْط' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۱۳۷۔ یعنی اپنے ننانوے کو سو بنانے کی فکر میں اِسی طرح ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۱۳۸۔ اصل الفاظ ہیں: 'خَرَّ رَاكِعًا'۔ لفظ 'خَرَّ' دلیل ہے کہ وہ صرف جھکے ہی نہیں، اِس کے ساتھ اُنھوں نے سجدہ بھی کیا۔

۱۳۹۔ یہ خطا کیا تھی؟ قرآن نے اِس کی تصریح نہیں کی، لہٰذا ہمیں بھی اُس کو جاننے کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کے سامنے مقدمہ جس تمثیل کی صورت میں رکھا گیا ہے، اُس کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ بادشاہ کی حیثیت سے کسی شخصی یا اجتماعی ضرورت کے لیے کسی دوسرے کی ملکیت سے تعرض کرنے کی کوئی خواہش غالباً اُن کے دل میں پیدا ہوئی یا اُن کی طرف سے اُس کا اظہار ہوا اور اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی یہ صورت پیدا کر دی۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا
تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿٢٦﴾
وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿٢٧﴾ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اے داؤد، ہم نے تمھیں زمین میں حاکم بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان (اسی طرح) انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو اور اپنی خواہش کے پیچھے نہ چلو کہ وہ تمھیں خدا کی راہ سے بھٹکا دے۔[140] جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹکتے ہیں، اُن کے لیے یقیناً سخت سزا ہے، اِس لیے کہ اُنھوں نے روز حساب کو بھلا دیا۔ ۲۶

(لیکن یہ آکر رہے گا،[141] اِس لیے کہ) زمین و آسمان اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو ہم نے عبث پیدا نہیں کیا ہے۔[142] یہ اُن لوگوں کا گمان ہے جو انکار پر اڑ گئے ہیں۔ سو اِن منکروں کے لیے جہنم کی ہلاکت ہے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے اُن جیسا کر

۱۴۰۔ یہی ہدایت، ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام حکمرانوں کے لیے بھی ہے۔

۱۴۱۔ یعنی روز حساب۔

۱۴۲۔ یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ اگر حساب کا دن نہ آئے تو اِس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ یہ دنیا ایک باطل کارخانہ ہے، اِس میں کوئی حکمت اور کوئی مقصد نہیں ہے اور اِس کا خالق ایک کھلنڈرا ہے جس نے اپنا دل بہلانے کے لیے یہ دنیا بنا دی ہے جس میں حق و باطل اور خیر و شر میں سرے سے کوئی امتیاز ہی نہیں ہے۔ اِس طرح کی بات، ظاہر ہے کہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو فیصلہ کر بیٹھے ہوں کہ ہر چیز کو مان لیں گے، لیکن آخرت کو کسی حال میں نہیں مانیں گے، اگرچہ اُس کے دلائل کیسے ہی ناقابل تردید ہوں۔

كَالۡمُفۡسِدِيۡنَ فِي الۡاَرۡضِ ۡ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِيۡنَ كَالۡفُجَّارِ ﴿٢٨﴾ كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ
اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿٢٩﴾

دیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں؟ یا خدا سے ڈرنے والوں کو اُس کے نافرمانوں جیسا کر دیں گے؟ (ہر گز نہیں، یہ قرآن اِسی حقیقت کی یاددہانی کرتا ہے)، یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے، (اے پیغمبر)، تمھاری طرف نازل کی ہے۔اِس لیے کہ لوگ اِس کی آیتوں پر غور کریں اوراِس لیے کہ عقل والے اِس سے یاددہانی حاصل کریں۔۲۷-۲۹

[باقی]

اعتذار

ماہنامہ اشراق مارچ ۲۰۲۴ء کے شمارے میں صفحہ ۵۲ پر تحریر میں ایک لائن ''ان کے نانا قیس بن زید کی شادی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم سے ہوئی تھی۔''، غلطی سے شائع ہوگئی تھی۔اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

—— ادارہ

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: ڈاکٹر محمد عامر گزدر

علامات قیامت

(۷)

دجال کا خروج، نزولِ مسیح اور یاجوج وماجوج کا خروج

— ۱ —

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:[1] «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَنْزِلَ الرُّومُ بِالْأَعْمَاقِ أَوْ بِدَابِقٍ، فَيَخْرُجُ إِلَيْهِمْ جَيْشٌ مِنَ الْمَدِينَةِ، مِنْ خِيَارِ أَهْلِ الْأَرْضِ يَوْمَئِذٍ، فَإِذَا تَصَافُّوا، قَالَتِ الرُّومُ: خَلُّوا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الَّذِينَ سَبَوْا مِنَّا نُقَاتِلْهُمْ، فَيَقُولُ الْمُسْلِمُونَ: لَا، وَاللّٰهِ لَا نُخَلِّي بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ إِخْوَانِنَا، فَيُقَاتِلُونَهُمْ، فَيَنْهَزِمُ ثُلُثٌ لَا يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ أَبَدًا، وَيُقْتَلُ ثُلُثُهُمْ، [وَهُمْ[2]] أَفْضَلُ الشُّهَدَاءِ عِنْدَ اللّٰهِ، وَيَفْتَتِحُ الثُّلُثُ، لَا يُفْتَنُونَ أَبَدًا فَيَفْتَتِحُونَ قُسْطَنْطِينِيَّةَ، فَبَيْنَمَا هُمْ يَقْتَسِمُونَ الْغَنَائِمَ، قَدْ عَلَّقُوا سُيُوفَهُمْ بِالزَّيْتُونِ، إِذْ صَاحَ فِيهِمِ

الشَّيْطَانُ: إِنَّ الْمَسِيحَ - يَعْنِي الدَّجَّالَ - قَدْ خَلَفَكُمْ فِي أَهْلِيكُمْ، فَيَخْرُجُونَ، وَذَالِكَ بَاطِلٌ، فَإِذَا جَاءُوا الشَّامَ خَرَجَ، فَبَيْنَمَا هُمْ يُعِدُّونَ لِلْقِتَالِ، يُسَوُّونَ الصُّفُوفَ، إِذْ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ، فَأَمَّهُمْ، فَإِذَا رَآهُ عَدُوُّ اللهِ ذَابَ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ، فَلَوْ تَرَكَهُ لَانْذَابَ حَتَّى يَهْلِكَ، وَلَكِنْ يَقْتُلُهُ اللهُ بِيَدِهِ، فَيُرِيهِمْ دَمَهُ فِي حَرْبَتِهِ».

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہو گی، جب تک رومی (عیسائی) اعماق[1] یا فرمایا کہ دابق[2] میں نہ اتر جائیں[3]۔ اُن سے مقابلے کے لیے شہر[4] سے ایک لشکر نکلے گا جو اُس وقت روے زمین کے بہترین لوگوں پر مشتمل ہو گا۔ پھر جب وہ (دشمن کے سامنے) صف بستہ ہو جائیں گے تو رومی کہیں گے: تم ہمارے اوراِن لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جنھوں نے ہمارے کچھ لوگوں کو قیدی بنایا ہوا ہے تاکہ ہم اِن سے قتال کریں۔ یہ سن کر مسلمان کہیں گے: نہیں، بخدا ہم تمھارے اور اپنے بھائیوں کے درمیان سے نہیں ہٹیں گے۔ چنانچہ وہ اُن (عیسائیوں) سے جنگ کریں گے۔ پھر اِن (مسلمانوں) میں سے ایک تہائی پسپائی اختیار کر لیں گے، جن کی توبہ اللہ تعالیٰ کبھی قبول نہیں فرمائیں گے[5]۔ اور ایک تہائی مسلمان قتل کر دیے جائیں گے اور وہ اللہ کے نزدیک افضل ترین شہدا ہوں گے۔ اور باقی ایک تہائی کو فتح حاصل ہو جائے گی، جس کے بعد اُنھیں کبھی آزمایش میں نہیں ڈالا جائے گا[6]۔ پھر وہ قسطنطنیہ کو فتح کر لیں گے[7]۔ (اس فتح کے موقع پر) وہ اپنی تلواروں کو زیتون کے درختوں پر لٹکا کر غنیمت کے اموال آپس میں تقسیم کر رہے ہوں گے کہ شیطان اُن کے درمیان میں چیخ کر اعلان کرے گا کہ مسیح، یعنی دجال (نمودار ہو کر) تمھارے پیچھے تمھارے گھر والوں تک پہنچ چکا ہے،

چنانچہ یہ سن کر وہ نکلیں گے، لیکن یہ خبر جھوٹی ہو گی[8]۔ البتہ جب وہ شام پہنچیں گے تو دجال واقعتاً نمودار ہو جائے گا[9]۔ پھر وہ (اُس سے) قتال کی تیاری کرتے ہوئے صف بندی کر رہے ہوں گے کہ نماز کے لیے اقامت کہی جائے گی اور عیسیٰ ابن مریم (آسمان سے) نازل ہو جائیں گے، اور (نماز میں) اُن کی امامت کریں گے[10]۔ پھر اللہ کا دشمن (دجال) جب عیسیٰ ابن مریم کو دیکھے گا تو اِس طرح پگھل جائے گا، جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتا ہے۔ چنانچہ اگر عیسیٰ ابن مریم اُس کو چھوڑ بھی دیں تو وہ پگھل کر ہلاک ہو جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُس کو اُنھی کے ہاتھ سے قتل کریں گے، اور وہ (اُسے مار کر) لوگوں کو اپنے نیزے پر اُس کا خون دکھائیں گے۔

۱۔ اِس سے غالباً عمق مراد ہے، جس کے لیے علاقے کی وسعت کے لحاظ سے جمع کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہ دابق کے قریب حلب اور انطاکیہ کے درمیان ایک ضلع ہے۔

۲۔ حلب سے چار فرسخ، کم و بیش ۳۲ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک قریہ ہے۔

۳۔ یہ غالباً شام و فلسطین پر صلیبی لشکروں کی تاخت یا آخری زمانے کی کوئی جنگ ہے، جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں اِسی طرح دکھائی گئی۔ اِس طرح کے معرکوں میں کئی جگہ قیدیوں کے پکڑنے اور چھڑانے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ بعید نہیں کہ اُنھی میں سے کوئی واقعہ آپ کو دکھایا گیا، جسے راویوں نے اِس اجمال کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۴۔ اِس سے مدینۃ النبی بھی مراد ہو سکتا ہے اور دابق کے قریب حلب یا کوئی دوسرا شہر بھی۔

۵۔ یہ، ظاہر ہے کہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب لشکر کا کوئی حصہ عین معرکے کے وقت، دشمن کے ساتھ کسی سازش کے نتیجے میں، بزدلی دکھائے اور اپنی پسپائی کے نتیجے میں پورے لشکر کو خطرے میں ڈال دے۔

۶۔ یعنی اُس طرح کی کسی آزمایش میں نہیں ڈالا جائے گا، جو لشکر کے ایک حصے کی پسپائی کے بعد اُنھیں عین میدان جنگ میں پیش آئی۔

۷۔ رؤیا میں صدیوں کے واقعات اِسی طرح ممثل ہوتے ہیں۔ ۱۰۹۶ء سے ۱۳۰۰ء تک فتح و شکست کے جو مراحل پیش آئے، پھر صلاح الدین ایوبی کی فتح اور بالآخر سلطان محمد فاتح کے قسطنطنیہ پر قبضے کو گویا پے در پے ایک ہی سلسلۂ واقعات کی صورت میں دکھا دیا گیا ہے۔

۸۔ یعنی یہ خبر کہ اپنے خروج کے بعد تاخت کرتا ہوا وہ تمھارے علاقوں تک پہنچ چکا ہے۔

۹۔ اصل میں لفظ 'خرج' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ مدعا غالباً یہ ہے کہ پھر وہ اِس لشکر پر حملے کے لیے سامنے آجائے گا۔

۱۰۔ اِس معاملے میں روایتوں کا اختلاف پیچھے زیر بحث آچکا ہے۔ اِسی طرح نزول کی حقیقت بھی بیان ہو چکی ہے۔ اِس کی تفصیلات پیچھے ''نزول مسیح'' کے باب میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن اصلاً صحیح مسلم، رقم ۲۸۹۷ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی تنہا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور اِس کا ایک ہی متابع ہے، جو صحیح ابن حبان، رقم ۶۸۱۳ میں نقل ہوا ہے۔

۲۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۸۱۳۔

— ۲ —

إِنَّ كُلَيْبَ بْنَ شهابٍ قَالَ:[1] كُنْتُ جَالِسًا مَعَ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي مَسْجِدِ الْكُوفَةِ: فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ: أَأَنْتَ الْقَائِلُ تُصَلِّي مَعَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ؟ قَالَ: يَا أَهْلَ الْعِرَاقِ إِنِّي قَدْ عَلِمْتُ أَنْ سَيُكَذِّبُونِي وَلَا يَمْنَعُنِي ذَالِكَ أَنْ أُحَدِّثَ بِمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، حَدَّثَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ: «أَنَّ الدَّجَّالَ يَخْرُجُ مِنَ الْمَشْرِقِ فِي حِينِ فُرْقَةٍ مِنَ النَّاسِ فَيَبْلُغُ كُلَّ مَبْلَغٍ فِي أَرْبَعِينَ يَوْمًا فَيَأْزِلُ الْمُؤْمِنُونَ مِنْهُ أَزْلًا شَدِيدًا، وَتَأْخُذُ الْمُؤْمِنِينَ فِيهِ شِدَّةٌ شَدِيدَةٌ، فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَيُصَلِّي بِهِمْ فَإِذَا رَفَعَ

رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ أَهْلَكَ اللّٰهُ الدَّجَّالَ وَمَنْ مَعَهُ»، فَأَمَّا قَوْلِي إِنَّهُ حَقٌّ، قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: وَهُوَ الْحَقُّ، وَأَمَّا قَوْلِي: إِنِّي أَطْمَعُ أَنْ أُدْرِكَ ذَالِكَ فَلَعَلِّي أَنْ أُدْرِكَهُ عَلَى مَا يُرَى مِنْ بَيَاضِ شَعْرِي وَرِقَّةِ جِلْدِي وَقَدْحِ مَوْلِدِي فَيَرْحَمُنِي اللّٰهُ تَعَالَى فَأُدْرِكُهُ فَأُصَلِّي مَعَهُ، ارْجِعْ إِلَى أَهْلِكَ فَأَخْبِرْهُمْ بِمَا أَخْبَرَكَ أَبُو هُرَيْرَةَ، فَقَالَ الرَّجُلُ: أَيْنَ يَكُونَ ذَالِكَ؟ قَالَ: فَأَخَذَ حَصًى مِنْ مَسْجِدٍ، فَقَالَ: مِنْ هَاهُنَا وَأَعَادَ الرَّجُلُ عَلَيْهِ، فَقَالَ: أَتُرِيدُ أَنْ أَقُولَ مِنْ مَسْجِدِ الْكُوفَةِ؟ هُوَ يَخْرُجُ مِنَ الْأَرْضِ قَبْلَ أَنْ تُبَدَّلَ، يَجْعَلُهُ اللّٰهُ حَيْثُ شَاءَ.

کلیب بن شہاب کہتے ہیں: میں کوفہ کی مسجد میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اُن کے پاس ایک شخص آیا اور اُن سے کہنے لگا: کیا یہ آپ کا کہنا ہے کہ آپ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھیں گے؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: عراق والو، مجھے معلوم تھا کہ (یہاں کے) لوگ مجھے جھٹلائیں گے، لیکن یہ چیز مجھے اُس بات کو بیان کرنے سے نہیں روک سکتی جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ اللہ کے صادق و مصدوق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بتایا ہے کہ دجال اُس زمانے میں، جب لوگ افتراق و انتشار کی حالت میں ہوں گے، مشرق کی طرف سے نمودار ہو گا[1]۔ پھر چالیس دن میں وہ ہر جگہ پہنچے گا اور مسلمان اُس سے بڑی مشکل اور تنگی میں پڑ جائیں گے اور اُس کے بارے میں مسلمان سخت مصیبت کی گرفت میں آجائیں گے۔ پھر عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے اور مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے۔ سو جب وہ رکوع سے اپنا سر اٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ دجال اور اُس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دے گا[2]۔ (ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) جہاں تک میرا یہ کہنا ہے کہ یہ سچی خبر ہے تو وہ اِس لیے کہ یہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو برحق ہی ہوتا ہے۔ اور میرا جو یہ کہنا ہے کہ مجھے اُن کو پا لینے، (یعنی اُن سے ملاقات) کی توقع ہے تو شاید اِس بڑھاپے میں جب میرے بال سفید ہو چکے ہیں، جلد نرم ہو چکی ہے اور میں پیرانہ سالی کے عالم میں ہوں، اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائیں اور میں اُن کو پا لوں اور اُن کے ساتھ نماز پڑھوں۔ تم واپس جا کر اپنے اہل خانہ کو (بھی) یہ خبر دو جو ابو ہریرہ نے تمھیں دی ہے۔ اُس شخص نے کہا: یہ کہاں ہو گا؟ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مسجد سے کچھ کنکر اٹھائے اور کہا: یہاں سے ہو گا۔ اُس آدمی نے اپنا سوال پھر دہرایا تو اُنھوں نے جواب دیا: کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھ سے کہوں کہ (دجال) کوفہ کی مسجد سے نکلے گا؟ وہ وقوع قیامت سے پہلے زمین کے اُس خطے سے نمودار ہو گا، جہاں سے اُس کا ظہور اللہ کی مشیت ہو گی[3]۔

۱۔ یعنی اصفہان سے، جس کا ذکر پیچھے بھی ہو چکا ہے۔

۲۔ یہاں اجمال ہے یا راوی سے بیان میں غلطی ہوئی ہے، اِس لیے کہ دوسری روایتوں میں صراحت ہے کہ دجال کو سیدنا مسیح قتل کریں گے۔

۳۔ اِس سے واضح ہے کہ اوپر 'مِنْ هَاهُنَا'، یعنی 'یہاں سے ہو گا' کے الفاظ بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اُسی طرح غصے میں کہے ہیں، جس طرح اِس سے پچھلے جملے میں 'مِنْ مَسْجِدِ الْكُوفَةِ' فرمایا ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند اسحاق بن راہویہ، رقم ۲۶۲ سے لیا گیا ہے، اور یہی اِس کا تنہا ماخذ ہے۔

— ۳ —

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ سَالِمٍ، قَالَ: سَمِعْتُ يَعْقُوبَ بْنَ عَاصِمِ بْنِ عُرْوَةَ بْنِ مَسْعُودٍ الثَّقَفِيِّ، يَقُولُ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرٍو، وَجَاءَهُ رَجُلٌ، فَقَالَ:[1]

مَا هَذَا الْحَدِيثُ الَّذِي تُحَدِّثُ بِهِ؟ تَقُولُ: إِنَّ السَّاعَةَ تَقُومُ إِلَى كَذَا وَكَذَا، فَقَالَ: سُبْحَانَ اللهِ أَوْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ - أَوْ كَلِمَةً نَحْوَهُمَا - لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَا أُحَدِّثَ أَحَدًا شَيْئًا أَبَدًا، إِنَّمَا قُلْتُ: إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدَ قَلِيلٍ أَمْرًا عَظِيمًا، يُحَرَّقُ الْبَيْتُ، وَيَكُونُ وَيَكُونُ، ثُمَّ قَالَ [عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو:[2]] قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي أُمَّتِي فَيَمْكُثُ [فِيهِمْ[3]] أَرْبَعِينَ - لَا أَدْرِي: أَرْبَعِينَ يَوْمًا، أَوْ أَرْبَعِينَ شَهْرًا، أَوْ أَرْبَعِينَ عَامًا - فَيَبْعَثُ اللهُ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ كَأَنَّهُ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُودٍ [الثَّقَفِيُّ، فَيَظْهَرُ[4]] فَيَطْلُبُهُ فَيُهْلِكُهُ، ثُمَّ يَمْكُثُ النَّاسُ سَبْعَ سِنِينَ،[5] لَيْسَ بَيْنَ اثْنَيْنِ عَدَاوَةٌ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ رِيحًا بَارِدَةً مِنْ قِبَلِ الشَّأْمِ، فَلَا يَبْقَى عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ أَوْ إِيمَانٍ إِلَّا قَبَضَتْهُ، حَتَّى لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ دَخَلَ فِي كَبِدِ جَبَلٍ لَدَخَلَتْهُ عَلَيْهِ، حَتَّى تَقْبِضَهُ» قَالَ: سَمِعْتُهَا مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «فَيَبْقَى شِرَارُ النَّاسِ فِي خِفَّةِ الطَّيْرِ وَأَحْلَامِ السِّبَاعِ، لَا يَعْرِفُونَ مَعْرُوفًا وَلَا يُنْكِرُونَ مُنْكَرًا، فَيَتَمَثَّلُ لَهُمُ الشَّيْطَانُ، فَيَقُولُ: أَلَا تَسْتَجِيبُونَ؟ فَيَقُولُونَ: فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَيَأْمُرُهُمْ بِعِبَادَةِ الْأَوْثَانِ [فَيَعْبُدُونَهَا[6]]، وَهُمْ فِي ذَالِكَ دَارٌّ رِزْقُهُمْ،[7] حَسَنٌ عَيْشُهُمْ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ، فَلَا يَسْمَعُهُ أَحَدٌ إِلَّا أَصْغَى لِيتًا وَرَفَعَ لِيتًا، قَالَ: وَأَوَّلُ مَنْ يَسْمَعُهُ رَجُلٌ يَلُوطُ حَوْضَ إِبِلِهِ، قَالَ: فَيَصْعَقُ، وَيَصْعَقُ النَّاسُ،[8] ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ - أَوْ قَالَ يُنْزِلُ اللهُ -

مَطَرًا كَأَنَّهُ الطَّلُّ أَوِ الظِّلُّ، فَتَنْبُتُ مِنْهُ أَجْسَادُ النَّاسِ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ أُخْرَى، فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ، ثُمَّ يُقَالُ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ هَلُمُّوا إِلَى رَبِّكُمْ، وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ، قَالَ: ثُمَّ يُقَالُ: أَخْرِجُوا بَعْثَ النَّارِ، فَيُقَالُ: مِنْ كَمْ؟ فَيُقَالُ: مِنْ كُلِّ أَلْفٍ تِسْعَمِائَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِينَ، قَالَ فَذَاكَ يَوْمَ يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا، وَذَالِكَ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ».

یعقوب بن عاصم ثقفی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا: یہ کیا حدیث ہے جو آپ بیان کرتے ہیں کہ فلاں فلاں واقعہ رونما ہونے تک قیامت قائم ہو جائے گی؟ یہ سن کر ابن عمرو نے تسبیح یا تہلیل یا اِسی طرح کے کوئی کلمات کہے۔ (اور پھر کہا:) اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں کسی کو کبھی کوئی بات بیان نہیں کروں گا۔ میں نے تو بس یہ کہا تھا کہ کچھ عرصے بعد تم لوگ بہت بڑے بڑے واقعات دیکھو گے۔ بیت اللہ کو جلا دیا جائے گا اور فلاں اور فلاں واقعہ ہو گا[1]۔ پھر عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں دجال نمودار ہو گا اور وہ اِن میں چالیس دن یا فرمایا کہ چالیس مہینے یا پھر فرمایا تھا کہ چالیس سال رہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث فرمائیں گے، وہ دیکھنے میں گویا عروہ بن مسعود ثقفی کی طرح ہوں گے۔ وہ جب نمودار ہوں گے تو دجال کا تعاقب کر کے اُس کو ہلاک کر دیں گے۔ اِس کے بعد لوگ سات سال تک اِس طرح رہیں گے کہ کہیں دو لوگوں کے مابین دشمنی تک نہ ہو گی[2]۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا چلائیں گے، جس سے روے زمین پر ایک آدمی بھی ایسا نہیں رہے گا، جس کے دل میں ذرہ برابر بھی بھلائی یا ایمان ہو گا، مگر یہ کہ وہ ہوا اُس کی روح قبض کر لے گی، یہاں تک کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی پہاڑ کے اندر بھی داخل ہو جائے گا تو یہ ہوا وہاں بھی داخل ہو کر اُس کی روح قبض کر لے گی۔ ابن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں۔

(پھر) آپ نے فرمایا: اِس کے بعد ایسے بُرے انسان باقی رہ جائیں گے جو (برائی میں) پرندوں کی طرح ہلکے، (یعنی تیزی سے سبقت کرنے والے) ہوں گے اور درندوں جیسی (اندھی) عقل والے ہوں گے۔ وہ معروف کو اچھا جانیں گے، نہ منکر کو بُرا سمجھیں گے۔ پھر شیطان انسانی صورت میں اِن کے سامنے آکر کہے گا: کیا تم میری بات نہیں مانتے؟ وہ اُس سے پوچھیں گے: تو ہمیں کیا حکم دیتا ہے؟ وہ اُنھیں بتوں کو پوجنے کا حکم دے گا تو وہ اُن کو پوجنے لگیں گے۔ اور اِس ساری صورت حال میں اُن کا رزق اُن کو وافر ملتا رہے گا، اور وہ پرعیش زندگی گزار رہے ہوں گے۔ پھر صور پھونکا جائے گا تو جو شخص بھی اُس کو سنے گا، وہ (زمین پر گرتے ہوئے اپنی) گردن کو ایک جانب جھکائے گا اور دوسری جانب (صور کی آواز سننے کے لیے) گردن کو اونچا کرے گا۔ آپ نے فرمایا: سب سے پہلا شخص جو صور کی آواز سنے گا، وہ اپنے اونٹوں کے حوض کی لپائی کر رہا ہو گا کہ (اُس کی آواز سنتے ہی) وہ شخص اور باقی تمام انسان بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ پھر اللہ ایک ایسی بارش بھیجے گا یا فرمایا کہ بارش نازل کرے گا جو گویا پھوار کی طرح ہو گی یا فرمایا کہ سایے کی طرح ہو گی۔ پھر اِس بارش سے تمام انسانوں کے جسم (زمین سے) باہر نکل آئیں گے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو دفعتاً وہ کھڑے ہو کر تاکنے لگیں گے۔ پھر کہا جائے گا: لوگو، اپنے پروردگار کی طرف چلو، اور (فرشتوں سے کہا جائے گا:) اِن کو ذرا روکو، اِن سے کچھ پوچھنا بھی ہے۔ فرمایا کہ پھر حکم دیا جائے گا: آگ میں بھیجے جانے والوں کو (اِس ہجوم سے) باہر نکالو۔ پوچھا جائے گا: کتنوں میں سے (کتنے؟) حکم ہو گا: ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے[۳]۔ فرمایا کہ یہ وہ دن ہو گا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور یہی وہ دن ہو گا جب بڑی ہلچل پڑے گی۔

۱۔ یہ غالباً اُن واقعات کی طرف اشارہ ہے، جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور بنوامیہ کے درمیان اقتدار کی کش مکش کے نتیجے میں ہوئے۔

۲۔ یہ اُس امن وامان کی تعبیر ہے، جو اِن غیر معمولی واقعات کے بعد کچھ عرصے کے لیے قائم ہو جائے گا۔

۳۔ یہ پہلے انتخاب کا بیان ہے جو استحقاق کی بنیاد پر اور حساب کتاب کے بعد ہو گا۔ اِس کا اشارہ 'اِن سے کچھ

پوچھنا ہے‘ کے الفاظ میں ہو گیا ہے۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ اِس طرح کے مشاہدات میں اعداد محض تناسب کا تصور دلانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اِنھیں بیانِ حقیقت نہیں سمجھنا چاہیے۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ عفو و درگذر کا مرحلہ ہے، جس کے واضح اشارات ’يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ‘ اور اِس مضمون کی دوسری آیات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔ اس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۲۹۴۰ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے متابعات کے مراجع یہ ہیں: مسند احمد، رقم ۶۵۵۵۔ الاوائل، ابن ابی عاصم، رقم ۱۲۸۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۵۶۵۔ صحیح ابن حبان، رقم ۷۳۵۳۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۱۰۶۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۸۶۵۴۔ شعب الایمان، بیہقی، رقم ۳۴۵۔

۲۔ مسند احمد، رقم ۶۵۵۵۔

۳۔ نفس مصدر۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۵۶۵ میں یہاں ’سَبْعَ سِنِينَ‘ کے بجاے ’تِسْعَ سِنِينَ‘ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۶۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۵۶۵۔

۷۔ بعض طرق، مثلاً مسند احمد، رقم ۶۵۵۵ میں یہاں ’وَهُمْ فِي ذَالِكَ دَارَّةٌ أَرْزَاقُهُمْ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔

۸۔ بعض روایتوں، مثلاً صحیح ابن حبان، رقم ۷۳۵۳ میں یہاں ’ثُمَّ لَا يَبْقَى أَحَدٌ إِلَّا صَعِقَ‘ کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

توبہ

(۱)

'توبہ' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اِس کے لفظی معنی پلٹنا، لوٹنا اور رجوع کرنے کے ہیں۔ دین میں توبہ سے مراد خدا کی طرف پلٹنا، لوٹنا اور اُس کی طرف رجوع کرنا ہے۔ یہی عمل رجوع الی اللہ کہلاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ خدا کی نافرمانی پر ندامت و پشیمانی کے ساتھ انسان کے ترک گناہ کا نام ہے۔ پروردگار عالم کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ. (التحریم ۶۶: ۸)

''ایمان والو، اللہ کی طرف مخلصانہ رجوع کرو۔ امید ہے کہ تمھارا پروردگار تمھارے گناہ تم سے دور کر دے اور تمھیں ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں۔''

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو توبہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت دی ہے اور اپنے بندوں کو یہ عظیم بشارت دی گئی ہے کہ وہ اگر خدا سے سچے دل اور پوری انابت کے ساتھ توبہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کے گناہ معاف کر دے گا اور انھیں جنتوں میں داخل کرے گا۔ اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ توبہ دراصل وہی ہوتی ہے جو سچی اور مخلصانہ ہو۔ سورۂ ہود میں ارشاد باری ہے:

وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ. (۱۱: ۳)

''اور یہ کہ تم اپنے پروردگار سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف رجوع کرو۔''

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’اس آیت سے توبہ کے متعلق بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کے دو اہم رکن ہیں: ایک استغفار دوسرا توبہ۔ استغفار تو یہ ہے کہ آدمی اپنے جرم کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور اس سے آیندہ باز رہنے کا عہد کرے اور توبہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس صحیح راہ کو اختیار کرے جس کی طرف اللہ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اگر آدمی جرم سے باز نہ آئے اور صحیح روش اختیار نہ کرے تو زبان سے لاکھ توبہ توبہ کرے اس کی توبہ محض مذاق ہے۔‘‘(تدبر قرآن ۴/ ۱۰۷)

اِسی طرح سورۂ نور میں فرمایا:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.(۲۴: ۳۱)

’’ایمان والو، سب مل کر اللہ سے رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ‘‘۔

اِس آیت میں پورے مسلم معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے لیے یہ ابدی ہدایت دی گئی ہے کہ سب مسلمان توبہ کریں، یعنی رجوع الی اللہ اختیار کریں۔ یہ ہدایت فرد اور معاشرے، دونوں کے لیے یکساں ہے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرے اور خدا کا نافرمان نہیں، بلکہ فرماں بردار بندہ بن کر زندگی گزارے، کیونکہ فوز و فلاح کا راستہ صرف یہی ہے۔

توبہ ایمان باللہ کا لازمی تقاضا ہے

قرآن مجید کی اِن آیات اور اِن کے علاوہ متعدد آیات سے یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کے لیے اپنے گناہوں سے توبہ کرنا اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی جناب میں توبہ کرنے سے جان بوجھ کر گریز سرکشی کے زمرے میں آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے یہ الفاظ ہیں:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ. قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ.(الاعراف ۷: ۱۲-۱۳)

’’فرمایا: تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روک دیا، جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟ بولا: میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُس کو مٹی سے۔ فرمایا: اچھا تو یہاں سے اتر، اِس لیے کہ تجھے یہ حق نہیں کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے، سو نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔‘‘

یعنی ابلیس نے خدا کے حکم کے باوجود نہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا اور پھر اپنی اِس نافرمانی پر نہ خدا سے معافی ہی مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اُس کے اِس رویے کو تکبر سے تعبیر کیا۔

توبہ کی حقیقت

قرآن مجید کے نزدیک توبہ کی حقیقت کیا ہے، اِس میں کون کون سی چیزیں انتہائی ضروری ہوتی ہیں، جن کے بغیر در حقیقت توبہ معتبر ہی نہیں ہوتی۔ اِس حوالے سے درج ذیل آیات ہماری رہنمائی کرتی ہیں:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (التوبہ ۹:۱۱۸)

”اِسی طرح اُن تینوں پر رحمت کی نظر کی جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود اُن پر تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور اُنھوں نے اندازہ کر لیا کہ خدا سے خدا کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے، پھر اللہ نے اپنی رحمت سے توجہ فرمائی کہ وہ اُس کی طرف پلٹیں۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”... اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اگر اُس کے اندر ایمان ہو تو ہر گناہ پر اُس کا دل کڑھتا اور آزردہ ہوتا ہے اور ایک احساس ندامت کے ساتھ اُس کے اندر اپنے رب کی طرف رجوع ہونے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اگر آدمی اپنے اِس جذبے کے مطابق عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے دل اور زبان پر وہ الفاظ اور کلمات بھی جاری فرما دیتا ہے جو اُس کو پسند ہیں اور جن کو وہ شرف قبولیت بخشتا ہے۔ اِس سے محروم صرف وہ بد قسمت لوگ رہتے ہیں جن کا ضمیر کند اور جن کا ایمان مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدا سے بے پروا ہو جایا کرتے ہیں جس کی سزا اُن کو یہ ملتی ہے کہ خدا بھی اُن سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ آدم و ابلیس کی سر گذشت، جو سورۂ بقرہ میں بیان ہوئی ہے، وہ اِس کی نہایت حقیقت افروز مثال ہے۔“

(تدبر قرآن ۳/ ۲۶۰)

توبہ کے ساتھ اصلاح کا رویہ

ارشادِ باری ہے:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٚ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ. (الاعراف ۷:۲۳)

”دونوں بول اٹھے: پروردگار، ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اب اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور نامراد ہو جائیں گے۔“

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

”یہ آدم و حوا علیہما السلام کی وہ توبہ ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تنبیہ کے بعد کی۔... اس توبہ سے آدم نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی۔... آدم و حوا نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا، خدا سے معافی مانگی اور... اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان پر رحم فرمایا اور اس طرح آدم نے اپنے عمل سے اپنی ذریت کے لیے مثال قائم کی کہ اگر شیطان کے ورغلانے سے انسان کوئی ٹھوکر کھا جائے تو اس کے نتائج سے بچنے کی راہ توبہ ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/۲۳۷)

توبہ کے بارے میں سنت اللہ

سورۂ بقرہ آیت ۳۷ کے تحت مولانا اصلاحی رحمہ اللہ درج بالا سورۂ اعراف کی اِسی آیت ۲۳ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”توبہ کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کا بے قرار ہونا اور توبہ کے الفاظ کا ان کے دل میں ڈالا جانا اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا پتا دیتا ہے جو توبہ سے متعلق اس نے پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کر گزرتا ہے تو ندامت و شرمندگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ایک احساس اس کے اندر خود بخود ابھرتا ہے۔ یہ احساس اس کی فطرت کا ایک تقاضا ہے اور یہ اس وقت تک برابر ابھرتا رہتا ہے جب تک انسان غلطیوں اور گناہوں پر اصرار کر کے اپنے اس احساس کو بالکل کچل کے نہ رکھ دے۔ اسی خاص کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نفس لوامہ کو ودیعت فرمایا ہے۔“ (تدبرِ قرآن ۱/۱۶۹)

اِس کا مطلب یہ ہے کہ احساسِ ندامت کے بغیر توبہ بے معنی عمل ہے۔ سورۂ نحل میں توبہ کے ساتھ اصلاح کے لزوم کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيۡنَ عَمِلُوا السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ. (۱۶:۱۱۹)

”پھر اُن کے لیے جو جذبات سے مغلوب ہو کر برائی کر بیٹھیں، پھر اُس کے بعد توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو اِس کے بعد، (اے پیغمبر)، تیرا پروردگار، اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ تیرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔“

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہ اوپر کی تنبیہات کے بعد ایک بشارت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ خدا کی واضح ہدایات کے باوجود اب تک غلطیوں، جہالتوں اور تعصبات میں گرفتار رہے ہیں، ان کے لیے اب بھی نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ تمھارا رب ان لوگوں کو بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا جنھوں نے جہالت کے سبب سے برائیاں کیں، پھر اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری بعثت سے قبل جو تاریکی کا دور گزرا ہے، اس میں لوگوں نے خدا کی جو نافرمانیاں کی ہیں، اگر تمھاری اس دعوت کے بعد انھوں نے توبہ اور اصلاح کر لی تو ان کے لیے خدا کی رحمت میں داخل ہونے اور اس کی مغفرت کے مستحق ہونے کا موقع اب بھی باقی ہے۔ بد قسمت ہی ہوں گے وہ جو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں۔“

(تدبر قرآن ۴/۴۶۰)

اور سورۂ نساء میں ارشاد باری ہے:

وَالَّذٰنِ يَاۡتِيٰنِهَا مِنۡكُمۡ فَاٰذُوۡهُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا. (۴:۱۶)

”اور جو مرد و عورت تمھارے لوگوں میں سے اِس جرم کا ارتکاب کریں، اُنھیں ایذا دو۔ پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو اُن سے درگذر کرو۔ بے شک، اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔“

اِس آیت کے الفاظ 'تَابَا وَاَصۡلَحَا' کی تفسیر میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہ جو فرمایا تھا کہ ”اگر وہ توبہ اور اصلاح کر لیں تو ان سے درگذر کرو“ اس سے اتنی بات تو بالکل واضح ہو گئی تھی کہ رویے کی اصلاح توبہ کے لازمی شرائط میں سے ہے، اگر کوئی شخص اس برائی سے باز نہ آئے جس کا وہ مرتکب ہوا ہے تو زبان سے لاکھ توبہ توبہ کا ورد کرے، اس کی توبہ بالکل غیر معتبر ہے۔“ (تدبرِ قرآن ۲/۲۶۶)

توبہ کی قبولیت و عدم قبولیت کا اصول

وہ غلطیاں جن پر مواخذہ نہیں ہو گا

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ. (البقرہ ۲: ۲۲۵)

”اللہ تمھاری اُن قسموں پر تو تمھیں نہیں پکڑے گا جو تم بے ارادہ کھا لیتے ہو، لیکن وہ قسمیں جو اپنے دل کے ارادے سے کھاتے ہو، اُن پر لازماً تمھارا مواخذہ کرے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔“

یعنی جس عمل کے پیچھے کوئی ارادہ، کوئی باقاعدہ نیت یا کوئی پروگرام موجود نہیں ہوتا، اُس عمل کو باقاعدہ نیت اور ارادے کے ساتھ کیے گئے عمل کی طرح شمار نہیں کیا جائے گا[1]۔

یہی بات سورۂ احزاب میں بھی بیان ہوئی ہے:

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (۳۳: ۵)

”تم سے (بغیر ارادے کے) جو غلطی ہوئی، اُس کے لیے تو تم پر کوئی گرفت نہیں ہے، البتہ تمھارے دلوں نے جس بات کا ارادہ کر لیا، اُس پر ضرور گرفت ہے۔ اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔“

اِس آیت سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ خدا کے ہاں بغیر ارادے کے ہونے والی غلطی نہ تو گناہ شمار ہو گی اور نہ اس پر کوئی مواخذہ ہو گا۔

کبائر سے بچنے پر صغیرہ گناہوں کی بخشش کا وعدہ

ارشادِ باری ہے:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ

”تمھیں جن باتوں سے روکا جا رہا ہے، اُن کے بڑے بڑے گناہوں سے اگر تم پرہیز کرتے رہو تو

۱۔ البتہ وہ فی نفسہٖ دین میں ناگوار و ناپسندیدہ ہو سکتا ہے۔

مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا.(النساء۴:۳۱) "تمھاری چھوٹی برائیاں ہم تمھارے حساب سے ختم کر دیں گے اور تمھیں عزت کی جگہ داخل کریں گے۔"

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"... جن چیزوں سے اس (خدا) نے روکا ہے، ان کے کبائر سے پرہیز رکھو۔ اگر کبائر سے پرہیز رکھو گے تو صغائر کو وہ اپنے فضل و رحمت سے خود دور فرما دے گا، ورنہ کبائر و صغائر سب تمھارے اعمال نامے میں درج ہوں گے اور سب کا تمھیں حساب دینا ہو گا۔

یہاں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ صغائر سے بچنے کی راہ بھی یہی ہے کہ آدمی کبائر سے اجتناب کرے۔ جو آدمی اپنے ہزاروں کے قرضے چکاتا رہتا ہے، وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ کسی کے پانچ روپے دبا کر نادہند کہلانے کی ذلت گوارا کرے۔ بر عکس اس کے جو لوگ کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں، لیکن چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، ان کا حال زندگی بھر یہ رہتا ہے کہ مچھر کو چھانتے رہتے ہیں اور اونٹ نگلتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو یہ زیرے اور سونف تک کی زکوٰۃ کا حساب سمجھاتے ہیں، لیکن خود یتیموں کے مال اور اوقاف کی آمدنیوں سے اپنی کوٹھیاں بنواتے اور ان کو سجاتے ہیں۔" (تدبر قرآن ۲/ ۲۸۷-۲۸۸)

سورۂ نجم میں اِسی حوالے سے ارشادِ باری ہے:

اَلَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الۡمَغۡفِرَةِ. (۵۳:۳۲)

"جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے رہے، مگر یہ کہ کبھی کچھ آلودہ ہو گئے۔ (وہ اُنھیں معاف فرما دے گا)، تیرے پروردگار کا دامن مغفرت یقیناً بہت وسیع ہے۔"

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"... آدمی کسی گناہ میں آلودہ تو ہو جائے، لیکن پھر اُس سے کنارہ کش ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ معصوم بن کر زندگی گزارے۔ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جانا اُس سے بعید نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ اُس سے ضرور ہے کہ اُس کی حس ایمانی اتنی بیدار رہے کہ کوئی گناہ اُس کی زندگی کا اِس طرح احاطہ نہ کر لے کہ اُس کے لیے اُس سے پیچھا چھڑانا ہی ناممکن ہو جائے، بلکہ جب بھی اُس کا نفس اُس کو ٹھوکر کھلائے، وہ متنبہ ہوتے ہی توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے۔ جو لوگ اِس طرح زندگی گزارتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اُس کا دامن مغفرت بہت

وسیع ہے۔'' (تدبر قرآن ۸/۷۱)

گناہ کے بعد توبہ کا بہترین طریقہ

ارشاد باری ہے:

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا. (النساء ۴:۱۷)

''اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ سو وہی ہیں جن پر اللہ عنایت کرتا اور اُن کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔''

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے اِس کی تفسیر یہ بیان کی ہے:

''... اللہ کے اوپر صرف ان کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر گزرتے ہیں، پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ انھی لوگوں کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ نہ وہ کسی بات سے بے خبر نہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۶۶)

کن لوگوں کی توبہ رد کر دی جاتی ہے؟

وَلَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا. (النساء ۴:۱۸)

''اُن لوگوں کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے جو گناہ کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آ جاتا ہے، اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔ اِسی طرح اُن کے لیے بھی توبہ نہیں ہے جو مرتے دم تک منکر ہی رہیں۔ یہی تو ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے اِس آیت کی یہ تفسیر بیان کی ہے:

''فرمایا کہ اللہ کے اوپر صرف ان کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر گزرتے ہیں، پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ انھی لوگوں کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ نہ

وہ کسی بات سے بے خبر نہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی۔ پھر وہ ان لوگوں کی توبہ کی کوئی ذمہ داری اپنے اوپر کیوں لے گا جو جانتے بوجھتے ٹھنڈے دل سے گناہ بھی کیے جا رہے ہیں اور توبہ کا وظیفہ بھی پڑھتے جا رہے ہیں۔''

(تدبر قرآن ۲/۲۶۶)

موت سے پہلے توبہ کی توفیق میسر آنا

سورۂ نساء کی درج بالا آیات ۱۷ اور ۱۸ کی تفسیر کرنے کے بعد مولانا اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''... اب ایک سوال رہ جاتا ہے کہ ان لوگوں کی توبہ کا کیا حکم ہے جن کو گناہ کے بعد جلدی توبہ کرنے کی سعادت تو حاصل نہیں ہوئی، لیکن اتنی دیر بھی انھوں نے نہیں لگائی کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو۔ اس سوال کے جواب میں یہ آیت خاموش ہے اور یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے، اسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن حکیم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بین الرجاء والخوف ہی رہے، لیکن کبھی کبھی ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اس امت کے اس طرح کے لوگ امید ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے، اس لیے کہ ان کے باب میں شفاعت کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔''

(تدبر قرآن ۲/۲۶۷)

توبہ کے عظیم نتائج

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا. (الفرقان ۲۵: ۷۰-۷۱)

''مگر یہ کہ جس نے توبہ کر لی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے اور جو توبہ کرے اور اچھے عمل کرے، اُس کو مطمئن ہونا چاہیے، اِس لیے کہ وہ پوری سرخ روئی کے ساتھ اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے۔''

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ اِن آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''... جو لوگ توبہ کر کے ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں ان کی نیکیاں ان کے اعمال نامے کے پچھلے گناہوں کو محو کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی جگہ پر ان کی نیکیوں کو رکھ دیتا ہے جو ان کے گناہوں کو

ڈھانک لیتی ہیں۔.... اس میں توبہ کرنے والوں کے لیے عظیم بشارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے گناہوں کے ساتھ ہی مریں گے، وہ تو بہر حال اپنے گناہوں سے دوچار ہوں گے، لیکن جو توبہ کر لیں گے، وہ نہایت سرخروئی کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹیں گے۔... یہ لوٹنا نہایت عزت و شان کا ہو گا۔ سیدنا مسیح ؑ نے کھوئی ہوئی بھیڑ والی تمثیل میں نہایت بلاغت سے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے توبہ کرنے والے بندے کی توبہ سے کس قدر خوش ہوتا ہے اور اس کو اپنے کس درجے کے فضل و کرم سے نوازتا ہے۔ وہی بات اس آیت سے واضح ہو رہی ہے۔

اس میں توبہ کے لیے حوصلہ افزائی کا یہ پہلو بھی ہے کہ بسا اوقات آدمی گناہ کی زندگی چھوڑنے سے اس وجہ سے گھبراتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے یہ زندگی چھوڑ دی تو اسے اپنے لیے ایک نیا ماحول تلاش کرنا پڑے گا جو ایک نہایت مشکل کام ہے۔ یہ آیت ایسے لوگوں کو تسلی دیتی ہے کہ جو لوگ برائی اور برے ماحول کو چھوڑتے ہیں، ان کو اللہ کی معیت اور سرپرستی حاصل ہوتی ہے اور جن کو یہ چیز حاصل ہو، وہ ہر چیز سے مستغنی ہیں۔"(تدبرِ قرآن ۵/۴۸۹)

توبہ سے متعلق اِن آیات سے درج ذیل اہم باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

۱۔ گناہ سے توبہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

۲۔ توبہ کے دو رکن ہیں: ایک استغفار اور دوسرا توبہ۔

۳۔ ہر صاحب ایمان شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی معمولی سے معمولی غلطی پر بھی استغفار اور توبہ کرے۔

۴۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ توبہ کے ساتھ اپنی اصلاح بھی کرے، کیونکہ کامیابی اور خوش بختی کا راستہ صرف یہی ہے۔

۵۔ بغیر ارادے کے سرزد ہونے والی غلطیاں گناہ شمار نہیں ہوتیں۔

۶۔ کبیرہ گناہوں سے بچنے والوں کے صغیرہ گناہ بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔

۷۔ توبہ کی بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں توبہ قبول کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے۔

۸۔ موت کو دیکھ کر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول نہ ہو گی۔

۹۔ کفر پر زندگی بھر قائم رہنے والے کی توبہ قبول نہ ہو گی۔

۱۰۔ سچی توبہ کرنے والوں کے گناہ بھی نیکیوں میں بدل دیے جائیں گے۔

[باقی]

محمد ذکوان ندوی

اعتکاف کا مقصد

اعتکاف کا لفظی مفہوم ’العُکوف علی الشيء‘ ہے، یعنی ایک مقصد کے تحت انتہائی یکسوئی اور انہماک کے ساتھ کسی چیز میں مشغول ہو جانا۔ گویا اعتکاف یہ ہے کہ آدمی خالص ذکر و عبادت کے اہتمام اور تعلق مع اللہ کی تجدید و استحکام کے جذبے کے تحت ایک گوشۂ مسجد میں اقامت پذیر ہو جائے (لزوم المسجد علی وجه التعبّد)۔ چنانچہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کرنے والے شخص کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

...هو يعتكف الذنوب، ويُجرٰى له من الحسنات كعامل الحسنات كلّها.
(ابن ماجہ، رقم ۱۷۸۱)

’’اعتکاف کرنے والا آدمی گناہوں سے الگ کنارہ کش ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ البتہ اُس کے لیے بالکل مسجد سے باہر دوسرے نیکوکاروں جیسا اجر مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔‘‘

اعتکاف کی اہمیت بتاتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:

من اعتكف يومًا ابتغاء وجه الله تعالىٰ، جعل اللّٰهُ بينه وبين النار ثلاثَ خنادق، أبعدُ مما بين الخافِقَين. (المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۷۳۲۲)

’’جو شخص صرف رضاے الٰہی کے جذبے کے تحت صدق دل سے ایک دن کا اعتکاف کرے، اللہ تعالیٰ جہنم اور اُس شخص کے درمیان تین خندق قائم فرما دیتا ہے۔ اِن میں سے ہر خندق کے درمیان وہی فاصلہ ہے جو اِس زمین اور آسمان کے مابین پایا جاتا ہے۔‘‘

تعلق مع اللہ کی تجدید

گفتگو کے دوران میں راقم نے ایک کالج کے چند طلبہ سے کہا کہ جس طرح آج کل طلبہ آئی ٹی (IT) اور نیٹ (NEET) ٹیسٹ کوالیفائی کرنے کے لیے اُس کی تیاری پر کمربستہ اور پوری طرح یکسو ہو جاتے ہیں، اُسی طرح ایک مومن گویا ایمان اور تعلق مع اللہ کا یہ ٹیسٹ کوالیفائی کرنے کے لیے اعتکاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

اعتکاف کے دوران میں ایک مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ ذکر و تلاوت، توبہ و اِنابت، ذکر و دعا، فکر و تدبر، صبر و شکر، تذکیر و دعوت، تعلیم و تعلم، محبت و مواسات اور صدقہ و اِنفاق کے ذریعے سے اپنا تزکیہ کرے۔ وہ ایک نئے عزم اور نئی ایمانی اور شعوری تیاری کے ساتھ دنیا پرستی اور نفس و شیطان کے فتنوں سے بلند ہو کر زندگی گزارنے لگے۔ اِس طرح وہ خدا سے اپنے تعلق کو زندہ کر کے اُس کی یاد میں جینے والا اور اپنے پورے وجود کے ساتھ ہمہ تن اُس کی جانب متوجہ ہو جانے والا انسان بن گیا ہو۔

اعتکاف اور معتکفین سے متعلق چند نبوی ارشادات

إن الله لينادي يوم القيامة: أين جيراني، أين جيراني؟ قال: فتقول الملائكة: ربّنا، ومن ينبغي أن يجاورك؟ فيقول: أين عُمّارُ المساجد؟

(سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ، رقم ۲۵۵۴)

''سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اعلان کریں گے کہ میرے پڑوسی کہاں ہیں؟ میرے پڑوسی کہاں ہیں؟ فرشتے پوچھیں گے: اے ہمارے رب، تیرا پڑوسی بننے کا یارا کسے ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: مسجدوں کو آباد کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟''

إنّ للمساجد أوتادًا. الملائكةُ جلساؤهم. إن غابُوا، يفتقدُونهم؛ وإن مرضوا، عادوهم؛ وإن كانوا في حاجة، أعانوهم. وقال: جليسُ المسجدِ على ثلاثِ خصالٍ: أخٍ مستفادٍ، أوكلمةٍ محكمةٍ، أورحمةٍ مُنتَظرَةٍ.

(مسند احمد، رقم ۹۴۲۵۔ سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ، رقم ۳۴۰۱)

''سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ مسجدوں میں

معتکف بعض افراد ایسے ہیں کہ فرشتے اُن کے ہم نشیں ہوا کرتے ہیں۔ اگر وہ موجود نہ ہوں تو فرشتے اُنھیں تلاش کرتے ہیں۔ اگر وہ بیمار پڑ جائیں تو فرشتے اُن کی عیادت کرتے ہیں اور اگر اُنھیں کوئی ضرورت پیش آجائے تو فرشتے اُن کا تعاون کرتے ہیں۔ مسجد میں بیٹھنے والا آدمی کوئی ایک فائدہ ضرور حاصل کرتا ہے: یا وہ کسی سے استفادہ کرتا یا کوئی حکیمانہ بات کہتا یا (ذکر و دعا اور فکر و تدبر میں مشغول ہو کر) رحمتِ الٰہی کا منتظر رہتا ہے۔''

أحبّ الناس إلى الله تعالىٰ أنفعهم للناس، وأحبّ الأعمال إلى الله عزوجل سرورٌ يدخله على مسلم؛ أو يكشف عنه كربةً؛ أو يقضي عنه دينًا؛ أو تطرد عنه جوعًا. ولأن أمشي مع أخ في حاجةٍ، أحبّ إلي من أن أعتكف في هذا المسجد (يعني مسجد المدينة) شهرًا. ومن كفّ غضبه، ستر الله عورته. ومن كظم غيظه، ولو شاء أن يُمضيه، أمضاه؛ ملأ الله قلبه رجاءً يوم القيامة. ومن مشىٰ مع أخيه في حاجةٍ حتى تتهيأ له، أثبت الله قدمه يوم تزول الأقدام. وإن سوء الخُلُق يفسد العمل كما يفسد الخلُّ العسلَ.

(سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ، رقم ۲۸۸۷)

''سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول، کون سے لوگ اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب اور کون سے اعمال اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں جو دوسرے انسانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے والے ہوں۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جو کام پسند ہیں، وہ یہ ہیں: ایک مسلمان کا اپنے بھائی کو خوش کرنا، اُس کی کوئی تکلیف دور کرنا، اُس کا قرض ادا کرنا، اُسے کھانا کھلانا، (وغیرہ)۔ (یاد رکھو) مجھے کسی آدمی کے ایک کام سے اُس کے ساتھ تعاون کے لیے چلنا میری اِس مسجد (مسجدِ نبوی) میں ایک ماہ اعتکاف کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔ (یاد رکھو) جس نے اپنے غصے کو روک لیا، اللہ تعالیٰ اُس کی خطاؤں پر پردہ ڈال دے گا۔ جس آدمی نے اپنے غصے کو نافذ کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود غصے کو پی لیا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کے دل کو مایوسی اور خوف کے بجائے رَجا اور اطمینان سے بھر دے گا۔ جو شخص اپنے بھائی کے ساتھ اُس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے نکلے، اللہ تعالیٰ اُسے اُس دن ثابت قدم رکھے گا جس دن (بہت سے لوگوں کے) قدم ڈگمگا رہے ہوں گے۔ اور (یاد رکھو) برے اخلاق نیکیوں کو اُسی طرح برباد کر دیتے ہیں جس طرح سرکہ، شہد کو برباد کر دیتا ہے۔''

”پارٹ ٹائم اعتکاف“

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی یا تو پورے دس دن کا اعتکاف کرے یا اگر وہ اِس قدر طویل اعتکاف نہیں کر سکتا تو اعتکاف سے بالکل دور اور محروم رہے، مگر ایسا سمجھنا درست نہیں۔ ایک شخص اگر ”پارٹ ٹائم جاب“ (part-time job) کر سکتا ہے، تو اُسے چاہیے کہ وہ حسب گنجایش، جز وقتی اعتکاف کا طریقہ اختیار کرے، یعنی ”پارٹ ٹائم اعتکاف“۔ اِس دوران میں آدمی کچھ اوقات کے لیے پوری طرح یکسو ہو کر اللہ سے اپنا تعلق اُستوار کرے۔ مثلاً وہ مختلف نمازوں سے پہلے اور بعد میں تھوڑا وقت نکال کر ذکر و دعا اور تلاوت و تدبر کے لیے اپنے آپ کو یکسو کرے۔

خلوت نشینی

اعتکاف دراصل تنہائی اختیار کرنے اور خلوت نشیں ہو جانے کا نام ہے۔ خلوت نشینی کا یہ طریقہ تمام معاصی و انتشار (distraction) سے بچنے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر و عبادت اور فکر و تدبر کے لیے انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ سیدنا عمر اِسی بنا پر فرمایا کرتے تھے:

خُذُوْا بِحَظِّکم مِنَ العُزلَةِ. (التمہید، ابن عبد البر ۱۷/۴۴۶۔ الزہد، ابن ابی عاصم ۴۸)

”تنہائی اور خلوت نشینی کے مواقع سے اپنا حصہ ضرور لیا کرو۔“

خلاصۂ کلام

اعتکاف کا مقصد تعلق مع اللہ کی تجدید اور خدا کے ساتھ جینے کی تربیت حاصل کرنا ہے، یعنی اعتکاف کے دوران میں تبتل الی اللہ (المزمل ۷۳: ۸) کے اِس خصوصی ماحول میں خدا اور اُس کی کتاب کے ساتھ زندگی گزارنے کی مشق۔ تبتل الی اللہ کا مطلب ہے: اللہ کے سوا ہر دوسری چیز سے کٹ کر صرف اور صرف اللہ سے لو لگانا اور اِن قیمتی لمحات کو اُسی کی یاد میں بسر کرنا۔

اعتکاف کا مقصد یہ ہے کہ ایک شخص اِس طرح اپنی تربیت کرے کہ وہ خدا کے ساتھ جینا سیکھ لے۔ اُس کے صبح و شام یادِ الٰہی میں بسر ہونے لگیں۔ وہ تقویٰ و حسن اخلاق کا نمونہ ہو اور ایمان و اخلاق کے تقاضوں کے ساتھ زندگی گزارنے والا بن سکے ــــــ مسجد کا ’جسمانی اعتکاف‘ اُس کے لیے مسجد سے باہر کی دنیا کے اِس ’ذہنی اعتکاف‘ (intellectual seclusion) کا ذریعہ بن گیا ہو کہ دنیا کے مادی ہنگاموں کے درمیان کسی بھی لمحہ وہ خدا

سے غافل نہ رہے:

گو میں رہا، رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے، غافل نہیں رہا!

ذِکر و اعتکاف کے اِس ربانی ماحول اور اِن تربیتی درس گاہوں کے فیض یافتہ یہی وہ اہل ایمان ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ. (النور ۲۴: ۳۷)

”یہی وہ مردِ مومن ہیں، جن کے اندر تجارت اور خرید و فروخت (کے ہنگامے) اللہ کی یاد، اہتمامِ صلوٰۃ اور ایتاے زکوٰۃ سے غفلت پیدا نہیں کرتے۔ یہ لوگ اُس دن سے خائف ہو کر زندگی گزارتے ہیں جس (کی ہول ناکی) کے سبب دل الٹ جائیں اور دیدے پتھرا کر رہ جائیں گے۔“

[۱۰/ مارچ ۲۰۲۴ء]

ساجد حمید

’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟

(۱)

سورۂ قیامہ (۷۵) کی آیات ۱۶ تا ۱۹ کی تفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔ اکثر مفسرین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک تفسیر کی روشنی میں انھیں سمجھا ہے۔ اس مضمون میں پہلے ہم ان آیات کا تجزیہ کریں گے، اس کے بعد اس تفسیری روایت پر بھی نگاہ ڈالیں گے جس سے معروف تفسیر وجود میں آئی ہے۔ ہم ان آیات کا قرآنی الفاظ، دیگر نصوص قرآنی، روایات اور چنیدہ کلاسیکل تفاسیر کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔

آیات یوں ہیں:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ. اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ.(۷۵: ۱۶-۱۹)

ان کا سادہ ترجمہ، یعنی بغیر کسی تفسیری مفہوم کو پیش نظر رکھے، یوں ہے:

”آپ زبان کو قرآن کے لیے حرکت نہ دیجیے کہ آپ اس کے لیے عجلت کریں، اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، جب ہم اسے پڑھ دیں تو پھر آپ اس کے اس پڑھنے کی پیروی کیجیے گا، پھر اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔“

’تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘ کے معنی

’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ‘ کے معنی کیا ہیں؟ اس کے یہ معنی تو بالکل واضح ہیں کہ آپ

زبان مبارک کو قرآن کے لیے حرکت دیتے تھے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس حرکت دینے کی وجہ قرآن کے لیے عجلت تھی، لیکن اس بات کو مخفی رکھا گیا ہے کہ قرآن کے لیے زبان ہلانے کا عمل کیا تھا، اور یہ بھی بتایا نہیں گیا کہ قرآن کو یہ عجلت لینے (عجلت بالقرآن) کی وجہ کیا تھی۔ جن لوگوں نے انھیں متعین کیا ہے تو انھوں نے محض قیاس کیا ہے۔

زبان کو حرکت دینے کا عمل: مفسرین کی راے

'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ' کا ایک عمل مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ آپ جبریل علیہ السلام کے وحی ختم کرنے سے پہلے ہی قرآن کو پڑھنے لگتے، یعنی تلاوت یا قراءت قرآن کے لیے زبان مبارک کو حرکت دیتے تھے (تفسیر ابن عباس)۔ آپ جبریل سے قراءت میں منازعت کرتے تھے، اور تکمیل وحی تک توقف سے کام نہیں لیتے تھے (زمخشری)۔ آپ قرآن کو پڑھتے اور بہت زیادہ پڑھتے کہ یاد کر لیں (قتادہ بحوالہ طبری)۔ جب جبریل وحی لاتے تو آپ قرآن کی محبت میں اس کلام کو بولنے لگ جاتے (شعبی بحوالہ طبری)۔ یہ تمام عملی صورتیں حقیقت میں ایک ہیں، یعنی قیاسی ہیں، کسی کو نبی کریم یا قرآن کے کسی بیان سے تصدیق حاصل نہیں ہے۔

عجلت بالقرآن عند المفسرین

قرآن کو جلد لینے کی وجہیں درج ذیل بتائی گئی ہیں:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اترتے وقت ایک شدت میں سے گزرنا پڑتا تھا، اس وجہ سے آپ جلدی کرتے تھے، کہ جلدی جلدی قرآن کو اخذ (وصول) کر لیں (ابن عباس بحوالہ بخاری، رقم ۵۔ مسلم، رقم ۴۴۸)۔

۲۔ آپ قرآن یاد کرنے کے لیے ایسا کرتے تھے (ابن عباس بحوالہ ترمذی، رقم ۳۳۲۹)۔

۳۔ آپ اس لیے ایسا کرتے تھے کہ کہیں قرآن کا کوئی حصہ ہاتھ سے نہ نکل جائے (ابن عباس، بخاری، رقم ۴۹۲۸)۔

۴۔ اس لیے کہ آپ بھول نہ جائیں (قتادہ اور ضحاک بحوالہ طبری)۔

ان تمام آرا میں مرکزی حیثیت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حاصل ہے، اس لیے یہ تمام آرا یا انھی کی ہیں یا ان کی باتوں سے ماخوذ ہیں۔ یہ بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ' کی کم از کم تین وجوہات انھی سے منسوب ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ ان کی راے بدلتی رہی ہو۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ راویوں کے تصرفات سے بات بدلتی گئی ہو۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا ہے اب ہم تیقن سے نہیں کہہ سکتے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ

کی اصل راے کون سی ہے، اس لیے اب ہمارے پاس کوئی قابل وثوق ماثور بات موجود نہیں ہے۔ یہ تمام تفسیریں ماثور ضرور ہیں، مگر حدیث نبوی نہیں ہیں، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر مبنی ہیں۔

اب ایک ایک بات کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں کہ آیا اوپر بتائی گئی باتوں کا قرآن تحمل (accept) کرتا ہے یا نہیں؟

تجزیہ

وحی کی شدت و مشقت

ایک یہ راے اوپر بیان ہوئی کہ وحی کے عمل میں آپ کو ایک شدت کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس لیے آپ قرآن کو لینے میں جلدی کرتے تھے (بخاری، رقم ۵)۔

اگرچہ روایات میں ایسی باتیں ملتی ہیں،[1] لیکن قرآن مجید میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے کہ وحی اترتے وقت انبیا کسی تکلیف دہ عمل سے گزرتے تھے۔ حضرت نوح سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہم وسلم تک کی نبوتوں کا قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، لیکن کہیں ایسی چیز بیان میں نہیں آئی۔ سورۂ نجم میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کا بیان ملتا ہے، وہاں سے بھی کوئی ایسا تاثر سامنے نہیں آتا، بلکہ 'مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى' (النجم ۵۳: ۱۱) اور 'مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى' (النجم ۵۳: ۱۷) آیات دوسرا تاثر قائم کرتی ہیں کہ آپ وحی کے اترتے وقت کسی بھی جسمانی یا ذہنی عارضے یا تکلیف سے پاک تھے۔ حضرت موسیٰ کا احوال طور قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ وہ اللہ رب العزت سے عصا کے بارے میں بات کر رہے ہیں، وہ اللہ کو دیکھنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، اس ساری کیفیت سے یہ تاثر بالکل نہیں ملتا کہ آپ کسی تکلیف میں تھے۔ اگر کوئی کہے کہ فرشتہ پیغام لے کر آئے تو پھر ایسا ہوتا ہے۔ سورۂ نجم میں ایسے ہی دو مواقع کا ذکر ہے جب جبریل امین اپنی اصل

۱۔ مثلاً صحیح بخاری میں وارد ہے کہ 'عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ المُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، أَنَّ الحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سَأَلَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ، كَيْفَ يَأْتِيكَ الوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الجَرَسِ، وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ، فَيُفْصَمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ، وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ المَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِي فَأَعِي مَا يَقُولُ» قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الوَحْيُ فِي اليَوْمِ الشَّدِيدِ البَرْدِ، فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا' (رقم ۲)۔

صورت میں آئے تھے۔ قرآن میں اس کے علاوہ بھی دو مقامات ہیں کہ سیدہ مریم فرشتوں سے بحث کر رہی ہیں، کوئی دقت کے آثار نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے انسانی روپ میں آئے تھے، آپ کو ذرا بھی تکلیف نہیں تھی، بلکہ وہ پہچان بھی نہ سکے کہ آیا وہ فرشتے ہیں کہ انسان! (ہود ۱۱: ۶۹-۷۰)۔ وہ روایات جو وحی کو شدت والا عمل قرار دیتی ہیں، ان میں بھی فرشتے کی آمد والی وحی کو ہلکا قرار دیا گیا ہے (مسند الحمیدی، رقم ۲۵۸)۔ اگر جلوۂ طور اور اس کے حضرت موسیٰ پر اثرات پر قیاس کیا جائے تو حضرت موسیٰ کی وحی شدید تر ہونی چاہیے، اس لیے کہ وہ اللہ کی آواز سن رہے تھے۔ روایات کی بنا پر ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ آپ کی یہ وحی شدید تر ہوتی تھی تو تب اللہ کا یہ کہنا نہیں بنتا کہ آپ جلدی نہ کریں، اور نہ یہ کہنا بنتا ہے کہ ہم قرآن جمع کر دیں گے، یاد کرا دیں گے یا قراءت کرا دیں گے، بلکہ یہ کہنا بنتا ہے کہ آپ جلدی نہ کریں، یہ چند سال کا عمل ہے جلد ہی وحی مکمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ کی یہ زحمت جاتی رہے گی، لیکن وحی اترتے وقت یہ تکلیف آپ کو ہوتی رہے گی، آپ کو صبر کرنا ہو گا۔

دوسری وجہ جو بتائی گئی ہے، وہ تین نکاتی ہے:

۱۔ آپ یاد کرنے کے لیے ایسا کرتے تھے،

۲۔ اس لیے ایسا کرتے تھے کہ آپ سے قرآن کا کچھ حصہ کھو نہ جائے، یا

۳۔ آپ نازل ہوتا ہوا قرآن بھول نہ جائیں۔

یہ سہ جہتی بات بھی قرآن سے ٹکراتی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن دل پر ہوا تھا[۲]، اس میں یاد کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ فرض کریں کہ آپ واقعی دہرا دہرا کر یاد کرتے تھے تو تب بھی یہ بات درست نہیں لگتی، کیونکہ نزولی ترتیب سے اگر دیکھا جائے تو محققین کے نزدیک سورۂ قیامہ ۳۰ یا ۳۴ سورتوں کے بعد نازل ہوئی تھی، جب کہ سورۂ اعلیٰ اس سے بہت پہلے اتری تھی۔ نازل ہونے کی ترتیب میں ۷ یا ۱۸ سورتوں کے بعد اتری، یعنی سورۂ قیامہ سے کم از کم ۱۶ سورتیں پہلے اتر چکی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ سورۂ اعلیٰ میں آپ کو فرما دیا گیا تھا کہ ہم عنقریب آپ کو پڑھائیں گے تو آپ بھولیں گے نہیں۔ اس کے بعد بھولنے کے خوف کی کیا وجہ تھی؟ یہ تمام وجوہات، اسی آیت میں موجود 'لِتَعۡجَلَ بِهٖ' کے الفاظ سے بھی ٹکراتی ہیں، اس لیے کہ اس آیت کے مطابق آپ کی حرکت لسانی کا سبب عجلت بالقرآن ہے، نہ کہ نسیان اور کھو جانے کا خوف۔

۲۔ البقرہ ۲: ۹۷۔ 'قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِكَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَهُدًى وَّبُشۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ'۔

اب حرکت لسانی کے عمل کی طرف آئیے:

آپ جبریل امین کے وحی ختم کرنے سے پہلے ہی قرآن کو پڑھنے لگتے، یعنی قراءت قرآن کے لیے زبان مبارک کو حرکت دیتے تھے۔ قراءت کے دو معنی ممکن ہیں: ایک محض پڑھنا، اور دوسرے قراءت، یعنی اعراب اور تلفظ سیکھنا۔ محض پڑھنا عجلت بالقرآن کے لحاظ سے معنی خیز نہیں ہے۔ یعنی ابھی جبریل علیہ السلام نے قرآن کی تلاوت ختم نہیں کی ہوتی تھی تو آپ اسے پڑھنے کے لیے دہرانے لگ جاتے! مطلب یہ کہ جتنا جلدی پڑھیں گے، اتنی جلدی قرآن کا اگلا حصہ جبریل پڑھیں گے۔ اس صورت میں یہ فرض کرنا ہوگا کہ وحی اترنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک آیت جبریل سناتے، نبی کریم اسے دہراتے اور پھر اگلی آیت سنائی جاتی، آپ اسے بھی دہراتے اور پھر جبریل اگلی آیت سناتے، یوں وحی کے مکمل ہونے تک سنانے اور سننے کا عمل ہوتا۔ لیکن یہ بات خود اسی تفسیر کو قابل قبول نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں خود جبریل ایسا کرنے سے روک رہے ہیں۔ اگر یہ وحی اترنے کا طریقہ ہوتا تو یقیناً اس سے روکا نہ جاتا یا پھر یہ فرض کرنا پڑے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا تو پھر اس صورت میں یہ طرز عمل عجلت بالقرآن کی طلب سے ٹکرائے گا، اس لیے کہ آپ کے دہرانے سے وقت زیادہ لگے گا، اور قرآن کے اترنے میں دیر ہوگی۔ اس صورت میں اگلے جملے سے جس میں حرکت لسانی کا سبب عجلت بالقرآن بتایا گیا ہے، سے یہ جملہ جدا کرنا ہوگا، جو 'لِتَعْجَلَ بِهٖ' کے لام تعلیل کی وجہ سے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ توجیہ کسی طرح قابل قبول نہیں ہے کہ آپ جبریل کے وحی ختم کرنے سے پہلے پڑھنے لگ جاتے تھے۔

قراءت کے دوسرے معنی کے لحاظ سے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ آپ اعراب و تلفظ کے سیکھنے کے لیے ایسا کرتے تھے۔ اول تو اہل زبان ہونے کے اعتبار سے اس کی آپ کو ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ سورۂ اعلیٰ اس سورہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، اس میں قراءت کا بھی وعدہ ہے اور حفظ کا بھی۔ جس میں خدائی وعدۂ قراءت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حرکات و اعراب سمیت یاد کرایا جائے گا۔ پھر یہ بات سمجھ نہیں آرہی کہ قراءت کے لیے آپ ایسا کیوں کریں گے؟ زبان آپ کی ہے، بول کر اگر آپ کو قرآن سنایا جارہا ہے یا سیدھا دل پر اتارا جارہا ہے، یا بول کر دل میں اتارا جارہا ہے تو تینوں صورتوں میں آپ کے لیے قراءت سمیت ہی حفظ ہوگا۔ اسی طرح ایک عجمی کے لیے تو تلفظ مسئلہ ہو سکتا ہے کہ 'ضعف' کو 'ضَعْف'، 'ضُعْف' یا 'ضِعْف'، وغیرہ بول دے، لیکن ایک افصح العرب جس کی اپنی زبان میں قرآن نازل ہو رہا ہے (مریم ۱۹: ۹۷)، اسے اس قراءت کے لیے زبان ہلانے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ بالاجماع آپ تحریر پڑھ نہیں

سکتے تھے تو بے اعراب کی تحریر کے ساتھ تو قراءت کا مسئلہ یقیناً اہل زبان کے لیے بھی کہیں کہیں ہو سکتا ہے، لیکن آپ کو تو تحریری صورت میں کلام نہیں ملا، پھر قراءت کے لیے زبان ہلانے کی وجہ کچھ نہیں رہتی۔

زبان ہلانے کی دوسری عملی صورت یہ بیان ہوئی ہے کہ آپ جبریل علیہ السلام سے قراءت میں منازعت کرتے تھے، اور تکمیل وحی تک توقف سے کام نہیں لیتے تھے (زمخشری)۔ اگرچہ اس پر اوپر والے بعض اعتراضات وارد نہیں ہوتے، لیکن یہ بھی دل چسپ بات ہے، علامہ زمخشری کے عربی الفاظ یہ ہیں: 'إذا لقن الوحي نازع جبريل القراءة، ولم يصبر إلى أن يتمها، مسارعة إلى الحفظ وخوفًا من أن يتفلت منه'۔ منازعت کے دو معنی ممکن ہیں، شوق قرآن میں گویا جلدی جلدی لینے کے لیے کشاکش کرتے یا جبریل سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ دوسرے معنی یہاں ممکن نہیں ہیں۔ جب ایک ہستی قرآن دینے آئی ہے، اور دوسری لینے کو آمادہ ہے تو یہ کشاکش کیوں کر ہو گی؟ رہی کشاکش کی یہ صورت کہ ادھر جبریل وحی کا ایک جملہ مکمل کرتے، ادھر جھٹ سے آپ دہرا ڈالتے کہ اگلی آیت دیجیے تو یہ بھی وحی دل پر اتارنے کے منافی عمل ہے، خواہ وہ سنا کر دل میں اتاری گئی ہو۔ لہٰذا یہ عملی صورت بھی قابل قبول نہیں ہے۔ یہ طرز عمل عجلت کے بجائے تاخیر کا باعث بھی بنے گا۔

تیسری عملی صورت مفسرین نے یہ قیاس کی ہے کہ آپ قرآن کو پڑھتے اور بہت زیادہ پڑھتے کہ یاد کر لیں (قتادہ بحوالہ طبری)۔ اس کی صورت یہ سامنے آتی ہے کہ ادھر یہ جملہ اترا کہ 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' ادھر آپ نے گویا ''رٹنے'' کے انداز میں دہرانا شروع کر دیا 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'۔ اوپر کی ساری بحث سے واضح ہے کہ نہ آپ نے یاد کیا، نہ اس تکرار والی قراءت کی ضرورت تھی۔ نہ یہ بات 'لِتَعْجَلَ بِهٖ' کے ساتھ میل کھاتی ہے۔ رٹا لگانے سے عجلت بالقرآن کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔ سوائے اس کے کہ یہ مانا جائے کہ وحی کے دوران ہی میں یاد کرایا جاتا تھا، اور یاد ہوئے بغیر اگلی آیات اتاری نہیں جاتی تھیں۔ واضح ہے کہ یہ حقیقت وحی کے خلاف ہے۔ اوپر ہم اس پر بات کر چکے ہیں۔

چوتھی عملی صورت شعبی نے بیان کی ہے: جب جبریل وحی لاتے تو آپ قرآن کی محبت میں اس کلام کو بولنے لگ جاتے (شعبی بحوالہ طبری)۔ یہ بات اوپر کی کسی بات سے نہیں ٹکراتی، مگر قرآن میں اسی آیت میں موجود 'لِتَعْجَلَ بِهٖ' سے ٹکراتی ہے۔ اس لیے کہ کلام واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ آپ زبان عجلت بالقرآن کے مقصد سے ہلاتے تھے۔

مدعاے آیت

آیت ۱۶ میں ایک مشکل ہے۔ وہ یہ کہ آیت 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ' میں 'بِهٖ' دو جگہ ہے۔ تقریباً مذکورہ بالا مفسرین سب[3] کا اس پر اتفاق ہے کہ دونوں میں ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے[4]۔ اب اگر اسے کھول دیجیے تو جملہ یوں ہوگا 'لَا تُحَرِّكْ بِالقرآن لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِالقرآن'۔ اب غور کیجیے کہ پہلے 'بِالقرآن' کے معنی کیا ہوں گے: —— قرآن کو، قرآن کے لیے، قرآن میں، قرآن پر، قرآن کی وجہ سے، قرآن کے ساتھ، قرآن کے ہمراہ، —— وغیرہ معنی ممکن ہیں۔ زیادہ تر مفسرین نے قرآن پڑھنے کے معنی لیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے 'قرآن پر' یا 'قرآن کے لیے' کے معنی لیے ہیں کہ قرآن پر زبان کو نہ چلایئے، یا قرآن پڑھنے کے لیے زبان کو حرکت نہ دیجیے[5]۔

مثلاً، تفسیر ابن عباس میں، اس ترکیب کو یوں کھولا گیا ہے: 'لَا تُحَرِّكْ بِهِ: بِقِرَاءَة الْقُرْآن يَا مُحَمَّد لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ: بِقِرَاءَة الْقُرْآن قبل أَن يفرغ جِبْرِيل من قِرَاءَته عَلَيْكَ'۔ زمخشری نے اسے یوں کھولا ہے: 'لا تحرّك لسانك بقراءة الوحي ما دام جبريل صلوات الله عليه يقرأ لِتَعْجَلَ بِهِ لتأخذه على عجلة، ولئلا يتفلت منك'۔

دوسری مشکل اس آیت میں یہ ہے کہ 'لَا تُحَرِّكْ... لِسَانَكَ' کیا ہے: ''زبان نہ ہلایئے'' ظاہر ہے کہ یہ ہر اس عمل یا تکلم کے لیے بولا جا سکتا ہے، جس میں زبان ہل رہی ہو، تکلم، یعنی بولنا، کچھ مانگنا، باتیں کرنا، کوئی چیز سنانا، گنگنانا اور پڑھنا وغیرہ۔ قرآن کے حوالے سے تین چار معنی ہی ممکن ہیں، قرآن پڑھنا، غنغنانا[6]، قرآن سنانا

۳۔ کچھ مفسرین کے اختلاف کا امکان ہے، مثلاً قفال رحمہ اللہ نے یہ ضمیر مجرمین کے اعمال نامے کی طرف راجع مانی ہے کہ سورہ میں مذکور مجرم سے کہا گیا ہے کہ اپنے اعمال نامے کو بہ عجلت پڑھنے میں زبان نہ چلا۔

۴۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ یوں غیر مذکور اشیا کے لیے اچانک ضمیر کا آنا، لسانی امور میں مانا ہوا ہے۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب وہ چیز پورے ماحول میں نمایاں اور معلوم ہو۔ مثلاً 'اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ' (القدر ۹۷: ۱) 'اَنْزَلْنٰهُ' میں ہاے منصوب بغیر مرجع کے قرآن کے لیے آگئی ہے یا مثلاً اقبال کے اس شعر میں ''یہ'' اقبال کے شاعری یا بال جبریل کے لیے ایسے ہی آیا ہے: محمد بھی ترا قرآن بھی جبریل بھی تیرا... مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا۔

۵۔ یہ دو مرتبہ آیا ہوا 'بِهٖ' ایسا ہے جیسا اس آیت میں 'بِالَّذِیْ' اور 'بِهٖ' ہے: 'وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا' (۱۷: ۸۶)۔

۶۔ یہ گنگنانے کی ایک قراءت ہے، گنگنانا زیادہ تر گیتوں اور شعروں کے ساتھ مستعمل ہے، اس کی اس شاعت کو کم

اور قرآن مانگنے کا مطالبہ کرنا۔یعنی درج ذیل معنی ممکن ہیں:

	ترجمہ	مقصود کلام
۱	قرآن پڑھنے کے لیے زبان کو حرکت نہ دیجیے:	یاد کرنے کے لیے یا دل میں اتری ہوئی وحی کو فہم یا شعور میں لا کر دہرانے کے لیے
۲	قرآن کا مطالبہ کرنے کے لیے زبان کو زحمت نہ دیجیے:	مزید وحی کا مطالبہ کہ مخاطبین کے اعتراضات کا جواب یا مزید ہدایت انھیں پہنچائی جائے
۳	قرآن سنانے کے لیے زبان کو ہلائیے نہیں:	جبریل کو سنانا کہ منزّل قرآن یاد ہو گیا کہ نہیں یا لوگوں کو ابلاغ کے لیے سنانا
۴	قرآن غنغنانے کے لیے زبان نہ ہلائیے:	یعنی قرآن کی حلاوت وتاثیر دل میں اتارنے کے لیے مدھم آواز میں لحن سے پڑھنا

اوپر ہم تفصیل سے بات کر آئے ہیں کہ پہلے اور تیسرے معنی کی کوئی گنجایش کلام میں نہیں ہے۔چوتھے معنی بھی مناسب نہیں، ایک اس لیے کہ پورے کلام کے بغیر حلاوت وتاثیر مشکل ہے کہ ایک آیت اترے تو آدمی فوراً حلاوت کے لیے پڑھنے لگے۔قرآن کے اعلیٰ کلام ہونے کی وجہ سے یہ ناممکن نہیں ہے کہ ایک ایک آیت حلاوت عطا کرتی ہو۔ لیکن پھر بھی جو پوری بات کی حلاوت اور اثر ہوتا ہے، اس کے لیے یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا فہیم وفطین انسان وحی پوری ہونے کا انتظار لازماً کرے گا۔ دوسرے اس لیے کہ حلاوت کے لیے پڑھنا، عجلت بالقرآن سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ حلاوت کے لیے پڑھنا، عجلت کے بجاے وحی اترنے میں رکاوٹ بنے گا کہ ادھر قرآن اترے اور آپ اسے لحن سے پڑھنا شروع کر دیں تو اگلی آیات اتارنے میں مشکل ہو گی کہ آپ اگلی وحی کے لیے تیار نہیں رہے۔ تیسرے اس لیے کہ اس عمل کا اللہ کے اپنے ذمے لیے ہوئے تین کاموں 'جَمْعَهٗ'، 'قُرْاٰنَهٗ' اور 'بَيَانَهٗ' سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جس کام سے روکا گیا ہے، اس کام کے بعد جو جملے تسلی کے لیے یا روکنے کی تعلیل کے لیے بولیں جائیں، روکی گئی بات سے ان کا تعلق ہونا ہی چاہیے، خواہ ادنیٰ سا ہی کیوں نہ ہو۔

اس تفصیل کے بعد اب سوال یہ ہے کہ پھر 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ' کا مطلب ہے کیا؟ اگر ہم روایات کے بجاے قرآن کے الفاظ جو بات کہتے ہیں، انھی پر بھروسا کر لیں تو کسی نص سے ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بات یہ

کرنے کے لیے 'غنغنانے' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ قرآن کے غیر شایان شان لفظ نہ ہو۔

ہے کہ آپ نے قرآن کو جلدی مانگنے کے لیے مطالبہ کیا، اور یہ مطالبہ ظاہر ہے کہ بول کر ہوا تھا، لہٰذا زبان مبارک حرکت کر رہی تھی۔ اوپر گوشوارے (table) میں بیان کیے گے دوسرے معنی یہاں مراد ہیں۔

'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ' میں 'بِهٖ' کی تفسیر میں مذکورہ بالا تمام مفسرین نے 'به' کی 'باء' اور 'هاء' کے درمیان حذف مانا ہے۔ ان کے محذوفات کچھ یوں کھولے جاسکتے ہیں: 'لا تُحَرِّكْ بِقرآتهِ لِسَانَكَ' (اسے پڑھنے کے لیے زبان کو حرکت نہ دیجیے)۔ دوسرے 'لا تُحَرِّكْ بِأخذهِ لِسَانَكَ' (حصول قرآن کے لیے زبان کو حرکت نہ دیجیے)، 'لا تُحَرِّكْ بحفظهِ لِسَانَكَ' (اسے یاد کرنے کے لیے زبان کو حرکت نہ دیجیے) وغیرہ۔ یہاں سب کے مطابق 'باء' تعلیل کی ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں کسی حذف کی ضرورت نہیں ہے، بس 'هاء' کا مرجع کھول دیں تو مطلب یہ ہوگا: 'لا تُحَرِّكْ بِالقرآنِ لِسَانَكَ' (قرآن کے لیے زبان کو حرکت نہ دیجیے)۔ اگر حذف کھولنا پیش نظر ہو تو یوں کھولا بھی جاسکتا ہے: 'لا تُحَرِّكْ بِطلبهِ لِسَانَكَ'، کہ قرآن کی طلب میں زبان کو حرکت نہ دیجیے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہیے کہ سورۂ قیامہ کے نزول کے دوران میں آپ نے شاید بار بار یہ مطالبہ کیا کہ مزید قرآن اتارا جائے۔ اس پر فرمایا گیا کہ اس کی طلب میں زبان کو زحمت مت دیجیے۔

آیت کے اس ٹکڑے: 'لِتَعْجَلَ بِهٖ' کو بہت فراموش کیا گیا ہے۔ یہ حرکت لسان کا مقصد بیان ہوا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور مقصد کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ 'عجل به' جب کسی چیز کے لیے آتا ہے تو اس کے پورے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو مطلوب یا مقرر وقت سے پہلے حاصل کرنا یا کر گزرنا، اور دوسرے معنی اس کے یہ ہوتے ہیں کہ سستی کے بغیر جلد جلد کر چکنا۔ واضح ہے کہ یہاں آیت میں صرف سورۂ قیامہ کے اترنے کی بات نہیں ہو رہی کہ اس وقت جو وحی اتر رہی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے جلدی چاہ رہے تھے۔ یہ معنی مناسب نہیں ہیں، کیونکہ آیا سورۂ قیامہ کے اتارتے وقت جبریل معمول سے زیادہ دیر لگا رہے تھے؟ تو آپ نے یہ جلدی کرنے کو کہہ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بے معنی بات ہے۔ اسی طرح زبان کی حرکت سے منع کرنے کے بعد تسلی کے لیے جو تفصیل دی گئی ہے، اس سے واضح ہے کہ سورۂ قیامہ کی وحی دل پر اتارنے میں دیر نہیں ہو رہی تھی، بلکہ قرآن کے نجماً نجماً اترنے میں جو وقت لگ رہا تھا، اس حوالے سے عجلت یہاں مراد ہے، کیونکہ آگے پورے قرآن کو زیر بحث لے آیا گیا ہے، صرف سورۂ قیامہ کو نہیں۔

آیات میں واحد مذکر کی ضمیریں بھی اسی بات کی نشان دہی کرتی ہیں، اس لیے کہ آیات یا سورت کے لیے ضمیریں مؤنث آنی چاہییں تھیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ قرآن بول کر جزو مراد ہے، یعنی قرآن سے مراد یہاں سورۂ قیامہ کا نزول ہے۔ اس مضمون کے لیے پھر 'إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ' اور 'إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ' کے الفاظ مناسب

نہیں ہیں۔ خواہ 'جَمْعَهٗ' کو یاد کرا دینے کے معنی ہی میں کیوں نہ لیں، اس لیے کہ سورۂ قیامہ دل پر اتر رہی تھی تو یاد تو ہوتی ہی جا رہی تھی، اور جب وہ اتر رہی تھی تو سورت کی صورت میں جمع بھی تھی، پھر اس قدر مؤکد لفظوں میں اپنے ذمے لینا کہ اس سورہ کا جمع کرنا اور پڑھا دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ ناقابل فہم ہے، پھر اس کے بعد 'اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ' بھی سورۂ قیامہ کے لحاظ سے بالکل غیر مناسب ہے کہ صرف اس کے بیان کی ذمہ داری اللہ نے لی تھی۔ لہٰذا اس سیاق کی روشنی میں دیکھا جائے تو 'لِتَعْجَلَ بِهٖ' میں پورے قرآن کے لیے عجلت مراد ہو گی، نہ کہ اترتی ہوئی سورۂ قیامہ کے لیے۔ ایک یہ صورت ہو سکتی ہے کہ ۱۵ آیات تک سورۂ قیامہ نازل کرنے کے بعد جبریل واپس جانے لگے ہوں تو آپ نے کہا ہو کہ مزید وحی چاہیے، ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی قرین قیاس نہیں ہے کہ بس آپ کو 'لَا تُحَرِّكْ' والی بات کہہ کر پھر باقی سورہ بھی نازل کر دی۔

غرض یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے جلد مکمل ہو جانے کا مطالبہ کر رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ آپ اس کے لیے بہ عجلت مطالبہ نہ کریں۔ رہا قرآن کا معاملہ تو تین امور ہمارے ذمے ہیں: 'جَمْعَهٗ'، 'قُرْاٰنَهٗ' اور 'بَيَانَهٗ'۔ آپ ان کے بارے میں تردد نہ کریں۔

اس قدر تفصیلی اور تسلی آمیز جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی یہ عجلت فطری اور عند اللہ قابل قبول تھی۔ قرآنی انبیا کی تاریخ میں دو قسم کی عجلت سامنے آتی ہے: ایک قابل قبول ٹھیری تھی اور دوسری نامقبول۔ حضرت موسیٰ کی تیس دن کے لیے طور پر آمد کے لیے عجلت قابل قبول تھی، حالاں کہ اس سے آپ کی قوم کو نقصان ہوا تھا[7]۔ لیکن حضرت یونس کی عجلت قبول نہیں ہوئی[8]، حالاں کہ اس سے ان کی قوم کو نقصان نہیں ہوا تھا،[9] کیونکہ دونوں عجلتیں اپنی نوع میں مختلف تھیں۔

[باقی]

۷۔ طٰہٰ ۲۰: ۸۳-۸۵۔ 'وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى. قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى. قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ'۔

۸۔ القلم ۶۸: ۴۸۔ 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ'۔

۹۔ یونس ۱۰: ۹۸۔ 'فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ'۔

محمد بلال

حیات امین احسن

(۷)

باب ۷

استعفیٰ کے بعد جماعت سے تعلق

جماعت اسلامی سے استعفیٰ دینے کے بعد بھی امین احسن جماعت سے ذہنی اور قلبی طور پر الگ نہیں ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں جماعت کو ایوب حکومت نے غیر قانونی قرار دے دیا تو آپ نے اس پر اداریہ لکھا تھا۔ ان دنوں مارشل لاء کی وجہ سے اخبارات اور رسائل پر سینسر شپ عائد تھا، اس لیے یہ اداریہ چھپ نہ سکا تھا۔ سہ ماہی ''تدبر'' اپریل ۱۹۹۸ء نے اپنے خصوصی نمبر میں یہ اداریہ شائع کیا، جو کہ حسب ذیل ہے:

''اس واقعہ سے قدرتی طور پر ہمیں بڑا صدمہ ہوا ہے کہ جماعت اسلامی خلاف قانون قرار دے دی گئی اور اس کے پچاس سے زائد ارکان اور مولانا مودودی (رحمۃ اللہ علیہ) گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ ایک عرصہ سے جماعت اور حکومت کی کشمکش جس انداز سے ترقی کر رہی تھی اس کا آخری متوقع نتیجہ یہی تھا جو بالآخر ظاہر ہو کر رہا۔ اس امر میں جماعت کے حضرات سے اب ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے۔ ہمارے اوپر ان حضرات کے لیے جو حق نصیحت عائد ہوتا تھا ہم پوری تفصیل کے ساتھ قولاً و عملاً سراً و علانیۃً اور تحریراً و تقریراً ادا کر چکے ہیں اور ان حضرات کی طرف سے اس کی پوری پوری سزا بھی بھگت چکے ہیں۔ البتہ حکومت کی خدمت میں اس موقع پر چند معروضات ہم پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی اس حق خیر خواہ کے تحت ہے جو پاکستان کے ایک شہری کی حیثیت سے اپنی

حکومت سے متعلق ہم پر عائد ہوتا ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے محترم صدر ریاست اور ان کے رفقا ہماری ان معروضات پر توجہ فرمائیں گے۔

پہلی گزارش تو ہم یہ کریں گے کہ اس وقت جماعت کے خلاف کسی اقدام کی، اور وہ بھی ایسے سخت اقدام کی، بظاہر حالات کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک صدر ایوب کی حکومت کا تعلق ہے وہ کافی مستحکم ہے اور اس کے استحکام میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک ایسی مستحکم حکومت کو اپنی حریف پارٹیوں کے معاملہ میں نہایت رواداراور فیاض ہونا چاہیے، اگرچہ ان کا رویہ کچھ غلط بھی ہو۔ جہاں تک جماعت کا تعلق ہے اس کا حال ایک عرصہ سے یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اس سے جو حسن ظن پیدا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ اس کے بہت سے ذی علم وذی صلاحیت ارکان اس سے الگ ہو گئے۔ مذہبی طبقہ اس سے سخت بدگمان، بلکہ بیزار ہے۔ عوام میں اس کا کچھ زیادہ اثر نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ اس کی تنظیم کا ظاہری ڈھانچہ اگرچہ کھڑا تھا، لیکن اس کے اندرونی نظام میں بددلی، مایوسی اور بے اعتمادی سرایت کر چکی تھی۔ جماعت نے اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے اب مذہب کو چھوڑ کر سیاست کے میدان میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے تھے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس میدان میں اس کا ہر قدم الٹا ہی پڑا۔ ایسے حالات میں جماعت کے خلاف اس سخت اقدام کا فائدہ بظاہر تو اس کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا کہ لوگوں کے اندر جماعت کے ساتھ اسی قسم کی ہمدردی پیدا ہو جو ایک مظلوم کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ جماعت اور مولانا مودودی کے خلاف حکومت کے بعض الزامات صریحاً غلط ہیں۔ ان کو بار بار دہرانا نہیں چاہیے۔

مولانا مودودی صاحب پاکستان کے کبھی مخالف نہیں تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے مقابل میں قائداعظم کے اور کانگریس کے مقابل میں مسلم لیگ کے پرزور حامی تھے۔ انھوں نے ''ترجمان القرآن'' میں قائداعظم کو 'کونوا عباد اللہ اخوانا' کا داعی لکھا تھا اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی نہایت پرزور حمایت کی تھی۔ البتہ ان کا یہ خیال ضرور تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت ملک کو تقسیم تو کرا سکتی ہے، لیکن تقسیم کے بعد پاکستان میں اسلامی حکومت نہیں قائم کر سکتی۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے مسلم لیگ سے الگ جماعت اسلامی کے قیام کو بھی ضروری سمجھا اور اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے مسلم لیگ کی قیادت پر تنقیدیں بھی کیں۔ ان تنقیدوں کا لب ولہجہ سخت وشدید ضرور تھا، لیکن ان سے مقصود ہندوؤں کو تقویت پہنچانا نہیں، بلکہ لیگ کے اندر اور لیگ سے باہر ایک اسلامی محاذ بنانا تھا۔

کشمیر کے معاملہ میں مولانا مودودی سے چوک ضرور ہوئی، لیکن یہ چوک محض ایک چوک تھی۔ اس میں ان کی کسی بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔ وہ بھارت اور پاکستان کے باہمی معاہدۂ صلح کا یہ لازمی تقاضا سمجھتے تھے کہ جب تک یہ معاہدۂ صلح قائم ہے اس وقت تک پاکستان کے عام افراد کشمیر کے معاملہ میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔ اپنے اس خیال کے تحت انھوں نے ایک رائے ظاہر کی، لیکن جماعت کی اس وقت کی مجلس شوریٰ نے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا، بلکہ اس نے یہ رائے دی کہ اس قسم کے معاہدات اپنے بین الاقوامی مفہوم ہی میں لیے جائیں گے۔ یہی صحیح شرعی موقف ہے۔ شوریٰ کی یہ رائے مولانا مودودی کی رائے سے اظہار بے تعلقی کے ہم معنی تھی۔ لیکن اس وقت اس قسم کی بے تعلقی کے اعلان کے بجائے سر ظفر اللہ کے جو اس وقت وزیر خارجہ تھے ایک اعلان سے فائدہ اٹھا کر یہ مناسب سمجھا گیا کہ مولانا مودودی اس اعلان کی روشنی میں اپنے موقف میں تبدیلی کر لیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا کر لیا اور اس کے بعد سے وہ اور ان کی جماعت برابر کشمیر کے لیے زبان سے اسی طرح جہاد کے لیے اعلان کر رہے ہیں جس طرح دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ پھر جس غلطی کی نوعیت ایک علمی غلطی کی تھی اور جس کی سزا مولانا اور ان کے ساتھ ان کے بعض بے قصور رفقاء بھی ۲۰ ماہ کی نظر بندی کی صورت میں بھگت چکے ہیں اب اس کو ایک الزام کی شکل میں بار بار کیوں دہرایا جا رہا ہے۔ میں یہ بات بھی پورے اعتماد کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی مذکورہ رائے کے اظہار سے مولانا کا مقصد پاکستانی مجاہدین کی حوصلہ شکنی نہیں تھا، بلکہ پاکستان کی حکومت کو اس بات پر اکسانا تھا کہ وہ معاہدے کی ذمہ داریوں سے براءت کا اعلان کر دے۔ ہمارے نزدیک مولانا کی یہ رائے ٹھیک نہیں تھی، لیکن اس میں جیسا کہ میں نے عرض کیا، کسی بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔

طلبہ کے ہنگاموں میں اگر حکومت جماعت کو ملوث سمجھتی ہے تب بھی جماعت کے خلاف کم از کم اس قسم کے کسی اقدام کی ضرورت نہیں تھی۔ اول تو حکومت نے اپنے حسن تدبیر سے حالات کو بالکل قابو میں کر لیا اور اس سلسلے میں اس کے فیاضانہ رویے سے ہر شخص نے اچھا تاثر لیا۔ ثانیاً، جماعت اس سلسلہ میں کافی بدنام ہو چکی تھی۔ ہمارا تو اندازہ یہ ہے کہ اس کے حصے میں جو بدنامی آئی وہ شاید وزن میں اس کے جرم کی مقدار سے زائد ہی رہی۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ جماعت کو اس بات کا موقع دیا جاتا کہ وہ از خود اپنے رویے پر نظر ثانی کرتی۔ اس طرح شاید اصلاح حال کے پہلو سے اس سے بہتر نتائج پیدا ہوتے جو اس اقدام سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

حکومت کا سب سے سنگین الزام جماعت پر مخالف حکومتوں سے مالی امداد حاصل کرنے کا ہے۔ حکومت نے یہ الزام جماعت پر اتنے جزم کے ساتھ لگایا ہے کہ اس کو پڑھ کر ہمارا تو دل کانپ گیا ہے۔ اس الزام کے بعد ہم

حکومت کو اس امر کا حق دار سمجھتے ہیں کہ وہ جماعت کو جو سزا چاہے دے۔ لیکن ساتھ ہی ہم جماعت کو بھی اس بات کا حق دار سمجھتے ہیں کہ اس الزام کی باقاعدہ عدالتی تحقیقات ہونی چاہیے۔ اگر اس کی تحقیقات نہ ہوئی تو ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کو مجرد ایک الزام سمجھیں گے اور جماعت کو مظلوم۔ ہمیں حکومت کے بعض ذمہ داروں کے اس اعلان سے اطمینان ہوا ہے کہ حکومت بھی اس معاملہ کو عدالت میں لانا چاہتی ہے۔ حکومت اس کام میں جتنی ہی جلدی کرے گی انصاف اور مصلحت، دونوں اعتبارات سے یہ بات بہتر ہو گی۔

ہماری ان گزارشات سے مقصود صرف یہ ہے کہ حکومت کو اس معاملے میں وہ عادلانہ اور حکیمانہ روش اختیار کرنی چاہیے کہ نہ ملک کی اپوزیشن پارٹیوں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ حکومت ان کو دبانا چاہتی ہے اور نہ بیرون ملک کے لوگوں پر یہ اثر پڑنے پائے کہ صدر ایوب کی حکومت کسی مشکل سے دوچار ہے کہ اسے جماعتوں کو خلاف قانون قرار دینے کے حربے کو استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ اور پھر سب سے زیادہ ہمیں جس بات کا احساس ہے وہ یہ ہے کہ مالی امداد والا الزام ہماری پوری قوم اور پورے ملک کے لیے موجب رسوائی ہے۔ چونکہ یہ الزام ایک مذہبی جماعت پر لگایا گیا ہے اس وجہ سے اس میں دین اور اہل دین کی خاص طور پر رسوائی ہے۔ اس وجہ سے اس الزام کی تحقیقات کا انتظام حکومت کو فوراً کرنا چاہیے۔'' (۳۹-۴۱)

۴/ نومبر ۱۹۸۹ء کو اپنی ہفتہ وار نشست میں گفتگو کرتے ہوئے امین احسن نے جماعت اسلامی کے ساتھ ہم دردی کا اظہار کرتے ہوئے ایک قرآنی دلیل دی:

''جماعت اسلامی کے متعلق لوگوں کے ساتھ مجھے ہم دردی ہے جو لوگ دین کا نام لیتے ہیں اور اس کے لیے یہ ہے کہ میں اللہ میاں سے کہتا ہوں کہ آپ کو جب مجوسیوں کے مقابل میں رومیوں کے ساتھ ہم دردی رہی ہے تو مجھے بھی ہم دردی ہے۔ اس لیے کہ دین کا نام لیتے ہیں، وہ لوگ دین کا نام نہیں لیتے۔ لیکن اس ہم دردی کے باوجود میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کو احساس دے، جو ان میں سے چاہتے ہیں ان کو سمجھا بھی دیتا ہوں۔''

۲۵/ نومبر ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ اپنی ہفتہ وار نشست میں گفتگو کرتے ہوئے امین احسن نے مولانا مودودی کی خوش قسمتی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''مولانا مودودی صاحب اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ہر گروہ کے گل سرسبد ساتھ لیے۔ دیوبند کی جماعت میں واقعہ یہ ہے کہ کوئی آدمی کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ مولانا منظور نعمانی ایک اچھے آدمی تھے، وہ مل گئے۔ جماعت ندوہ کے گل سرسبد علی میاں تھے، وہ مل گئے۔ مشائخ کی جمعیت کے گل سرسبد ہمارے دوست

شاہ جعفر تھے، وہ مل گئے۔ اور میں بھی کوئی جنگل میں کھلا ہوا گل تو نہیں تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے سوا سب چوٹی کے لوگ تھے۔"

اپریل ۱۹۸۸ء کو اپنی ہفتہ وار نشست میں امین احسن نے میاں طفیل محمد مرحوم کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتایا:

"میں پرسوں منصورہ میں پہنچ گیا تھا۔ ہوا یوں کہ احسان صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا، دس بارہ روز پہلے۔ تو نثار (آپا نثار فاطمہ مرحومہ) نے مجھے بتایا کہ آپ گئے نہیں۔ تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھے جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کے گھر کے ہمارے گھر کے لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ اور مجھے کیا مجھ سے زیادہ مریم (بیٹی) کو جانا چاہیے تھا۔ تو میں چلا گیا تو وہاں میاں طفیل صاحب کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ میاں صاحب یہیں ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ تو پھر میرے جی میں آیا کہ کھڑے کھڑے ان سے بھی علیک سلیک کر لیں۔ ورنہ محسوس کریں گے۔ ٹھیک نہیں ہے۔ تو میں چلا گیا۔ میرے ذہن میں آیا کہ میں میاں صاحب سے کچھ سوالات کروں۔ لیکن پھر طبیعت رک گئی۔ اس وجہ سے کہ خیال کریں گے کہ ابھی نیا نیا تو میں امارت سے الگ ہوا ہوں اور... مجھے یہ بات بہت کھٹک رہی تھی کہ یہ قاضی حسین احمد نام ہے نا؟ قاضی حسین احمد صاحب جو تقریریں کر رہے ہیں۔ کیا یہ تقریریں مجلس شوریٰ کی رہنمائی میں کر رہے ہیں یا ارشاد احمد حقانی کی رہنمائی میں کر رہے ہیں؟"

۲۵ / نومبر ۱۹۸۹ء کو اپنی ہفتہ وار نشست میں میاں طفیل محمد مرحوم کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ طفیل محمد صاحب آج بھی مجھے عزیز ہیں۔ یہ نہیں کہ عزیز نہ ہوں۔ عزیز ہیں انھوں نے میری بڑی خدمت کی ہے۔"

ایک غلط فہمی کا ازالہ

امین احسن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جماعت اسلامی میں گزرا، وہ برسوں اس کے فکر کے داعی رہے، اس کے لیے کئی علمی مباحثے کیے، اس لیے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ وہ جماعت سے تو اس کے بنیادی فکر کی وجہ سے تو الگ نہیں ہوئے، اس لیے عین ممکن ہے وہ اقامت دین کے اسی طرح قائل رہے ہوں، ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اسی مقام پر اس بات کی بھی وضاحت کر دی جائے۔ اس ضمن میں جناب جاوید احمد صاحب غامدی لکھتے ہیں:

"... میں نے جو کچھ ان سے سنا اور جو کچھ سمجھا ہے، اس کی بنیاد پر میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ اب

نہ وہ اقامت دین کے اس مفہوم کے قائل تھے جو جماعت اس سے مراد لیتی ہے، نہ اظہار دین کے وہ معنی ان کے نزدیک درست تھے جو مولانا مودودی نے بیان کیے ہیں۔" (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ۲۴)

"تدبر قرآن" اور جماعت اسلامی کا لٹریچر

لاہور سے امین احسن، سردار محمد اجمل خان لغاری کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ تصورِ دین سے متعلق جو غلط فہمیاں جماعت اِسلامی کے لٹریچر سے پھیلی ہیں ان کو تفسیر میں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اگر میری تفسیر اللہ نے پوری کرادی تو اس کا کوئی مطالعہ کرنے والا بھی، اگر وہ دیانت دار ہو گا، اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو گا جس میں یہ مبتلا ہیں، رہے خود غرض اور تقلید اعمی کے گرفتار اشخاص تو ان کا علاج تو پیغمبر لوگ بھی نہ کر سکے، میں اور آپ کیا کر سکیں گے۔

ویسے آپ میری یہ بات گرہ کر لیں کہ اب اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ جماعت اسلامی کوئی دینی فتنہ بن سکے یا اس ملک کی تاریخ میں کوئی صفحہ اپنے لئے مخصوص کرا سکے۔ اب یہ ماضی کا ایک واقعہ ضرور ہے، لیکن اس کی اہمیت ختم ہو چکی ہے اور مستقبل نے اپنے دروازے اس کے لئے بند کر لئے ہیں۔ اب یہ ایک نہایت حقیر سیاسی جماعت ہے اور اس کی سیاست اتنی احمقانہ ہے کہ یہ بہت جلد اپنی موت آپ مر جائے گی۔ میری تو یہ آرزو ہے کہ کاش حکومت انتخابات سے پہلے ان لوگوں کو چھوڑ دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھ لیں گے کہ یہ نادان لوگ اپنے تابوت میں آخری کیل خود اپنے ہاتھوں ٹھونک لیں گے۔" (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ۷-۸)

امین احسن لاہور سے ۱۵/ اگست ۱۹۵۹ء کو محمد احسن خان صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ مودودی صاحب مسائل میں جو توڑ مروڑ کر رہے ہیں وہ اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ سیاسی مناصب کے خواہاں ہیں۔ میں ان کی رائے کی اور ان کے دلائل کی غلطیاں واضح کر رہا ہوں۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ وہ یہ سارے پاپڑ کیوں بیل رہے ہیں۔ رہا طنز و تعریض کا معاملہ تو میں اس کو کوئی ضروری چیز نہیں سمجھتا، مگر مودودی صاحب کو اس معاملہ میں زیادہ حساس نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ تو طنز و تعریض کے بغیر چار سطریں بھی نہیں لکھ سکتے۔ تاہم مجھے اس پر اصرار نہیں ہے۔ ستمبر میں میرا مفصل جواب آ رہا ہے۔ میں نے آپ کے خط کے بعد اس کے بعض فقرے نکال دیے ہیں۔"

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ۲۰)

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

بطور غیر مسلم اقلیت قادیانیوں کے مذہبی حقوق کا مسئلہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

مبارک احمد ثانی بنام ریاست نامی مقدمے میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ گذشتہ دنوں کافی زیر بحث رہا۔ اس مقدمے میں قادیانی کمیونٹی کے ایک تعلیمی ادارے کے اندر قادیانی طلبہ کے مابین مرزا بشیر الدین محمود کی ''تفسیر صغیر'' کے نسخے تقسیم کیے جانے پر اس بنیاد پر ایف آئی آر کٹوائی گئی تھی کہ کسی تحریف شدہ ترجمے کی اشاعت قانوناً ممنوع ہے اور یہ کہ ''تفسیر صغیر'' پر الگ سے بھی قانونی پابندی عائد ہے۔ سپریم کورٹ نے اس دعوے کو مسترد کرتے ہوئے 'لا اکراہ فی الدین' کے مذہبی اصول کے علاوہ آئین کی ان دفعات کا حوالہ دیا ہے جن کے مطابق ہر مذہبی کمیونٹی کو اپنے مذہب کے اظہار اور اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کا اور اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اپنے اداروں میں اپنی کمیونٹی کے افراد کو مذہبی تعلیم دینے سے کسی کو نہیں روکا جا سکتا۔

بظاہر یہی مترشح ہوتا ہے کہ عدالت یہاں ''تبلیغ'' کرنے سے مراد اپنی کمیونٹی کے افراد کی تعلیم و تربیت ہی لے رہی ہے، نہ کہ عوامی تبلیغ و تشہیر کی اجازت دے رہی ہے۔ احمدی کمیونٹی کے حوالے سے آئین کی اس دفعہ کا مطلقاً ذکر کرنے سے ایک ابہام ساضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن بظاہر اس خاص مقدمے کے تناظر میں ایسا نہیں لگتا کہ عدالت کا مقصود عوامی سطح پر مذہبی تبلیغ کی اجازت دینا ہے۔ بہر حال اس عدالتی فیصلے نے ایک بار پھر مذہبی حلقوں کی اس تشریح کو واضح طور پر رد کر دیا ہے جو یہ حضرات قادیانیوں کے قانونی و مذہبی حقوق کے حوالے

سے اپنے تئیں کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ سال بھی عدالت نے ایک فیصلے میں واضح کیا تھا کہ اپنی چار دیواری کے اندر احمدیوں کو اپنی تمام عبادات از قسم نماز و قربانی وغیرہ ادا کرنے کا حق حاصل ہے۔ حالیہ فیصلے نے اس کو مزید موکد کر دیا ہے کہ قادیانی اپنی کمیونٹی کے دائرے میں اپنی مذہبی ضروریات کے لحاظ سے اپنا مذہبی لٹریچر بھی شائع اور مہیا کر سکتے ہیں۔ان پر خود کو مسلمان ظاہر کرنے یا اپنے مذہب کی عوامی تبلیغ کرنے کی پابندی ہے، لیکن اپنی کمیونٹی کے دائرے میں ان کے مذہبی حقوق اس بنیاد پر سلب نہیں کیے جا سکتے۔

اس تناظر میں اس فیصلے کے خلاف مخصوص مذہبی حلقوں کی طرف سے جو پراپیگنڈا مہم جاری کی گئی اور یہ تاثر پیدا کیا گیا کہ فیصلے میں قادیانی جماعت کے حوالے سے متعلقہ آئینی فیصلے اور قوانین کی نفی کی گئی ہے، اس کا محرک فیصلے میں کسی تعبیری و تشریحی ابہام کو دور کرانا نہیں ہے، بلکہ چونکہ فیصلہ واضح طور پر اس مذہبی مطالبے کی تردید کر رہا ہے کہ قادیانیوں کو ان کے اپنے تعلیمی اداروں میں بھی اپنا مذہبی لٹریچر استعمال کرنے سے روکا جائے اور اس مطالبے کے خلاف اصل فیصلے پر کوئی آئینی و قانونی اعتراض نہیں ہو سکتا، اس لیے اس کو تبلیغ کی اجازت کا رنگ دے کر فیصلے کے اصل نکتے سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایسی پراپیگنڈا مہموں کا ایک بڑا مقصد یہ تاثر قائم کرنا بھی ہوتا ہے کہ قادیانیوں سے متعلق آئینی و قانونی ضمانتوں کی اصل محافظ مذہبی جماعتیں ہیں اور آئینی ادارے بھی ان کے سامنے جواب دہ اور انھیں مطمئن رکھنے کے پابند ہیں۔ اگر مذہبی جماعتیں متحرک نہ ہوں تو حکمران اور عدالتیں اتنا بکاؤ مال ہیں کہ کسی بھی وقت سب کیے کرائے پر پانی پھیر سکتی ہیں۔ ساری مذہبی سیاست اس پرسیپشن پر کھڑی ہے اور اس مہم کے ذریعے سے اسی کو بحال رکھنے کی کوشش ہوئی ہے جو بظاہر پوری طرح کامیاب ہے۔

اس ضمن میں ایک اور عمومی اعتراض یہ کیا جا رہا ہے کہ عدالت کو ملزم کی ضمانت کے مسئلے تک محدود رہنا چاہیے تھا اور مذہبی آزادیوں کے حوالے سے کسی اصولی قسم کی گفتگو میں پڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس تنقید میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے پیرا گراف نمبر ۱۰ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، کیونکہ عدالت نے اس میں قرار دیا ہے کہ:

> ''اگر ریاست کے حکام صرف قرآن شریف پر عمل اور آئین پر غور کرتے اور قانون کا جائزہ لیتے تو مذکورہ بالا جرائم کے متعلق ایف آئی آر درج نہ کرائی جا سکتی۔ اس لیے فوجداری درخواست برائے اپیل نمبر L-1054 بابت ۲۰۲۳ء کو اپیل میں تبدیل کرتے ہوئے منظور کیا جاتا ہے اور معترضہ حکمنامہ کو منسوخ کرتے ہوئے درخواست گزار کے خلاف عائد کی گئی فرد جرم سے پنجاب (طباعت وضبط) قانون، ۲۰۱۱ء کی دفعہ ۷ مع دفعہ ۹

اور مجموعہ تعزیرات کی دفعات 298-C اور 295-B کو حذف کیا جاتا ہے۔“

محولہ جملہ صاف بتا رہا ہے کہ عدالت کی نظر میں سرے سے یہ مقدمہ ہی درج نہیں ہونا چاہیے تھا، کیونکہ یہ ہر گروہ کو مقررہ حدود میں دی گئی مذہبی آزادیوں کی آئینی ضمانت کے خلاف ہے۔ اسی نکتے کی وضاحت میں عدالت نے آئین کی مختلف دفعات کا حوالہ دیا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عدالت کی نظر میں ممنوعہ کتاب کی تقسیم یا اشاعت سے متعلق جس قانون کا حوالہ ایف آئی آر میں دیا گیا ہے، وہ قادیانیوں کی داخلی مذہبی آزادیوں پر قابل اطلاق ہی نہیں اور اس قانون کی بنیاد پر ان کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

اس معاملے کی بہت قریبی مماثلت گائے کی قربانی کے مسئلے کے ساتھ بنتی ہے جو متحدہ ہندوستان میں ہندو مسلم کشیدگی کا ایک بڑا عنوان تھا۔ ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ چونکہ گائے ان کے مذہب میں مقدس ہے، اس لیے مسلمان اس رسم کو کلیتاً ترک کر دیں۔ مسلمان رہنماؤں کی طرف سے جو موقف پیش کیا گیا، وہ یہ تھا کہ مسلمان، ہندوؤں کے عقیدے کے پابند نہیں ہیں اور نہ گاؤ کشی کو کلیتاً ترک کر سکتے ہیں، اور نہ قانون کی طاقت یا سماجی دباؤ کے زور سے مسلمانوں کو اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے، البتہ مسلمان یہ اہتمام ضرور کر سکتے ہیں کہ اس رسم کی ادائیگی میں ہندوؤں کے مذہبی احساسات کی رعایت کریں اور ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے ان کے جذبات مجروح نہ ہوں۔

مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے اس نوعیت کے اختلافات کے مجوزہ حل کے حوالے سے اکابر علما و زعما کی منظور کردہ ایک تفصیلی قرارداد ”کفایت المفتی“ کی جلد نہم میں نقل کی ہے۔ اس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:

”(ج) (۱) ہندوؤں کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ باہمی معاہدہ کے علاوہ مسلمانوں کو ان کے حق گاؤ کشی کے استعمال سے جبراً یا مقامی بورڈوں کو قرارداد یا قانون جماعت ساز کے قانون یا عدالت کے حکم سے روکا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کو اس کے لیے مسلمانوں کے نیک احساس اور دونوں قوموں میں بہتر تعلقات کے قائم ہو جانے پر بھروسہ کرنا چاہیے جس کی وجہ سے ہندوؤں کے جذبات کا مسلمانوں کے دلوں میں زیادہ احترام پیدا ہو گا۔

(۲) مذکورہ بالا دفعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ کسی مقامی رواج یا دونوں قوموں کے باہمی معاہدہ پر جو پہلے ہو چکا ہے، کوئی اثر نہ ڈالے گا اور نہ اس کو مسترد کرے گا اور نہ اس کی وجہ سے کسی ایسی جگہ گاؤ کشی کو اجازت ہو گی جہاں پہلے گاؤ کشی نہیں ہوئی ہے۔ اس بارے میں واقعات کے متعلق تمام جھگڑے قومی پنچایت جس کا ذکر تحریک نمبر ۳ میں ہو چکا ہے، طے کرے گی۔

(۳) ذبیحہ گاؤ اس طرح ہو گا جس سے ہندوؤں کے مذہبی احساسات کو صدمہ نہ پہنچے۔

(۴) اس کانفرنس کے مسلمان ممبران اپنے ہم مذہبوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ گائے کے ذبیحہ کو کم کرنے کی حتی الوسع کوشش کریں۔''(۳۳۰)

ہماری راے میں مسلمان ریاست میں بھی غیر مسلم اقلیتوں کے مذہبی حقوق کے حوالے سے اسی عملی انداز نظر کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

قادیانیوں کی تکفیر: غامدی صاحب کا نقطۂ نظر

جناب جاوید احمد غامدی نے کلمہ گو کی تکفیر سے متعلق اپنا نقطۂ نظر اپنی کتاب ''مقامات'' میں ''مسلم اور غیر مسلم'' کے عنوان سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اِس کے بعد اُن لوگوں کا معاملہ ہے جو مسلمان ہیں، اپنے مسلمان ہونے کا اقرار، بلکہ اُس پر اصرار کرتے ہیں، مگر کوئی ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کر لیتے ہیں جو عام طور پر اسلام کی تعلیمات کے منافی سمجھا جاتا ہے یا کسی آیت یا حدیث کی کوئی ایسی تاویل اختیار کر لیتے ہیں جسے کوئی عالم یا علما یا دوسرے تمام مسلمان بالکل غلط سمجھتے ہیں، مثلاً امام غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسے بزرگوں کا یہ عقیدہ کہ توحید کا منتہاے کمال وحدت الوجود ہے یا محی الدین ابن عربی کا یہ نظریہ کہ ختم نبوت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نبوت کا مقام اور اُس کے کمالات ختم ہو گئے ہیں، بلکہ صرف یہ ہیں کہ اب جو نبی بھی ہو گا، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا پیرو ہو گا یا اہل تشیع کا یہ نقطۂ نظر کہ مسلمانوں کا حکمران بھی مامور من اللہ ہوتا ہے جسے امام کہا جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اِس منصب کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا تقرر اِسی اصول کے مطابق خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے کر دیا گیا تھا جسے قبول نہیں کیا گیا یا علامہ اقبال جیسے جلیل القدر مفکر کی یہ راے کہ جنت اور دوزخ مقامات نہیں، بلکہ احوال ہیں۔

یہ اور اِس نوعیت کے تمام نظریات وعقائد غلط قرار دیے جا سکتے ہیں، اِنھیں ضلالت اور گم راہی بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن اِن کے حاملین چونکہ قرآن وحدیث ہی سے استدلال کر رہے ہوتے ہیں، اِس لیے اُنھیں غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِن نظریات وعقائد کے بارے میں خدا کا فیصلہ کیا ہے؟ اِس کے لیے قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔ دنیا میں اِن کے حاملین اپنے اقرار کے مطابق مسلمان ہیں، مسلمان سمجھے جائیں گے اور اُن کے ساتھ تمام معاملات اُسی طریقے سے ہوں گے، جس طرح مسلمانوں کی جماعت کے ایک فرد کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ علما کا حق ہے کہ اُن کی غلطی اُن پر واضح کریں، اُنھیں صحیح بات کے قبول کرنے کی

دعوت دیں، اُن کے نظریات و عقائد میں کوئی چیز شرک ہے تو اُسے شرک اور کفر ہے تو اُسے کفر کہیں اور لوگوں کو بھی اُس پر متنبہ کریں، مگر اُن کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے یا اُنھیں مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے، اِس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اِس لیے کہ یہ حق خدا ہی دے سکتا تھا اور قرآن و حدیث سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اُس نے یہ حق کسی کو نہیں دیا ہے۔'' (۲۳۱-۲۳۲)

بعض ناواقف ناقدین کے ہاں تکفیر کے باب میں استاذ گرامی جاوید احمد غامدی صاحب کے نقطۂ نظر کی یہ تعبیر دیکھنے میں آئی کہ یہ تو ایمانیات میں ریلیٹیوازم بن جاتا ہے کہ جو بھی اسلام کے نام پر جو کچھ بھی ماننا چاہے، مان سکتا ہے اور وہ کسی بھی قسم کا کفر یا شرک اختیار کرنے کے باوجود اس لیے مسلمان ہی رہے گا کہ وہ اس کو اسلام سمجھتا ہے۔ یہ بدیہی طور پر غامدی صاحب کے نقطۂ نظر کی بالکل غلط تعبیر ہے۔ غامدی صاحب کسی عقیدہ یا عمل کو کفر یا شرک کہنے کو غلط نہیں سمجھتے، بلکہ اس کے مرتکب کی تکفیر سے اختلاف کرتے ہیں۔

یہ اصولی طور پر ہماری کلامی روایت میں کوئی نیا نقطۂ نظر نہیں ہے۔ عقیدہ و عمل کو کفر کہنا، لیکن تاویل کی رعایت دیتے ہوئے یا موانع کا لحاظ کرتے ہوئے، نیز دعوتی مصلحت سے معین شخص یا گروہ کی تکفیر سے اجتناب کرنا علم کلام میں ایک معروف بات ہے۔ قادیانیوں کے حوالے سے بھی بعض اہل علم کا یہی رجحان رہا ہے جن میں مولانا عبد الماجد دریابادی معروف ہیں اور اس مسئلے پر مولانا اشرف علی تھانوی کے ساتھ اپنا مکالمہ انھوں نے اپنی کتاب ''حکیم الامت: نقوش و تاثرات'' میں نقل کیا ہے۔ یہی رجحان عرب علما میں بھی رہا ہے اور سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام علامہ مصطفیٰ صبری نے اپنی کتاب ''موقف العقل والعلم'' میں قادیانیوں کی تکفیر کے باب میں بعض مصری علما کے تردد پر تفصیلاً کلام کیا ہے۔

قریب کے عرب علما میں علامہ البانی تو واضح طور پر یہی موقف رکھتے ہیں جو غامدی صاحب کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی بھی گروہ کے عقائد کا کفریہ ہونا بیان کرنا چاہیے، لیکن متعین طور پر فرد کو یا پورے گروہ کو کافر نہیں کہنا چاہیے۔ اور یہ بات بھی وہ مرزا صاحب کے متبعین میں سے قادیانیوں کے متعلق کہتے ہیں، جب کہ لاہوری گروپ کے اعتقاد پر بھی کفر کا حکم نہیں لگاتے، کیونکہ وہ مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے (دیکھیے: جامع تراث العلامۃ الالبانی فی العقیدۃ ۴/ ۲۸۴، ۵/ ۶۹۸)۔ یہ موقف ہمارے ہاں ابتداءً مولانا مودودی کا بھی رہا ہے، تاہم آئینی فیصلے کے موقع پر انھوں نے یہ رائے ترک کر کے دونوں گروہوں کی تکفیر کے باب میں جمہور اہل علم کے موقف کی تائید کا طریقہ اختیار کیا۔

اصل میں، مذکورہ کلامی اصول کے ہوتے ہوئے قادیانیوں کی تکفیر پر جمہور علما کے اصرار کی وجہ عملی دینی

مصالح بنے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مصلحت تو قادیانیوں کی دعوتی جارحیت کا سد باب کرنا تھا جس کو مولانا تھانوی نے یوں بیان کیا کہ قادیانیوں کو تاویل کی رعایت دینے میں ان کے ساتھ تو شفقت ہے، لیکن عام مسلمانوں کے لیے یہ مہلک ہے، کیونکہ اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر قادیانی مسلمانوں کو گم راہ کرتے رہیں گے۔

دوسری اہم مصلحت علامہ اقبال اور مولانا مودودی نے واضح کی ہے کہ دائرۂ اسلام کے اندر نئی نبوت پر ایمان کی گنجایش مان لینے سے امت میں نئی نئی نبوتوں کی بنیاد پر فرقہ بندی کا ایک ایسا دروازہ کھل جائے گا جس میں پھر وحدت اور اجتماعیت کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ مولانا لکھتے ہیں:

"یہ امر نظر انداز نہ کیا جانا چاہیے کہ ختم نبوت کا یہ عقیدہ محض ایک اعتقادی مسئلہ نہیں ہے جس میں اختلاف رونما ہونے کے اثرات ونتائج صرف فکر وخیال کی دنیا تک محدود رہ سکتے ہوں، بلکہ یہی وہ واحد بنیاد ہے جس پر مسلمانوں کی پوری قومی عمارت قائم ہے، جس کے بقا پر مسلم ملت کی وحدت اور اس کا استحکام منحصر ہے، اور جس کے متزلزل ہو جانے کے اثرات ونتائج محض "مذہب" کے دائرے تک محدود رہ جانے والے نہیں ہیں، بلکہ تمدنی اور سیاسی اور معاشی اور بین الاقوامی ہر حیثیت سے ہمارے لیے سخت مہلک ہیں۔ تاریخ کے دوران میں مسلمانوں کے درمیان عقائد اور اصول اور فروع میں بے شمار اختلافات رونما ہو چکے ہیں اور اب بھی ہوئے جا رہے ہیں جن کے نہایت برے اثرات ہماری اجتماعی زندگی پر مترتب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ مگر شروع سے آج تک جس چیز نے تمام تفرقوں اور اختلافات کے باوجود ہم سب کو ایک ملت بنا رکھا ہے اور جس چیز کی بدولت ہمیشہ قومی خطرات ومصائب کے وقت یا اہم قومی مسائل پیش آنے پر ہمارا متحد ہو کر کام کرنا ممکن ہوا ہے، وہ صرف ایک رسول کی پیروی پر ہمارا متفق ہونا ہے۔ یہ ایک بنیاد بھی اگر متزلزل ہو جائے اور نئے نئے رسولوں کی دعوتیں اٹھ کر ہمیں الگ الگ امتوں میں بانٹنا شروع کر دیں تو پھر کوئی طاقت ہمیں مستقل طور پر پراگندہ ہونے سے نہ بچا سکے گی اور کوئی چیز ایسی باقی نہ رہے گی جو ہم کو کبھی جمع کر سکے۔ اس فتنۂ عظیم سے جو لوگ "رواداری" برتنے کا ہمیں مشورہ دے رہے ہیں، وہ صرف یہی نہیں کہ رواداری کے معنی اور اس کے حدود نہیں جانتے، اور صرف یہی نہیں کہ وہ اسلام سے ناآشنا ہیں، بلکہ درحقیقت وہ بڑی نیک نیتی، مگر بڑی نادانی وبے فکری کے ساتھ مسلم ملت کی قبر کھودنا چاہتے ہیں۔" (تحقیقاتی عدالت میں مولانا مودودی کا تیسرا بیان، ماہنامہ ترجمان القرآن، جلد ۴۲، شمارہ ۳، جون ۱۹۵۴ء، ص ۱۴۱-۱۴۲)

ہمارے نزدیک اس مسئلے کے دونوں پہلو اہم ہیں اور اہل علم کے لیے کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کی گنجایش موجود ہے۔ البتہ عملی دینی مصالح کے لحاظ سے جمہور اہل علم کا موقف زیادہ وزنی اور درست معلوم ہوتا ہے اور

اسی لیے ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔

تاہم غامدی صاحب کے نقطۂ نظر سے اس حد تک ہمیں بھی اتفاق ہے کہ خود کو مسلمان کہنے والے کسی فرد یا گروہ سے یہ حق چھیننا اور اس سے مطالبہ کرنا کہ وہ خود کو مسلمان نہ سمجھے یا نہ کہے، یہ مذہبی جبر کے زمرے میں آتا ہے اور دعوتی مصالح کے بھی خلاف ہے۔ مسلمان امت کسی گروہ کے متعلق یہ فیصلہ یقیناً کر سکتی ہے کہ وہ اسے مسلمان مانتی ہے یا نہیں، لیکن خود اس گروہ کو اس پر مجبور کرنا کہ وہ اسلام کی طرف اپنی نسبت سے دست بردار ہو جائے، غلط اور غیر منطقی بات ہے۔

قانونی طور پر اس گروہ کو صرف اس کا پابند کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ شناخت کو چھپا کر عام مسلمانوں کو التباس میں نہ ڈالے اور ایسے انداز سے اپنے عقائد کا اظہار نہ کرے کہ اس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہو۔ اس حوالے سے ہمارے ہاں مناسب قانون سازی موجود ہے جس کا انصاف کے ساتھ نفاذ ہونا چاہیے اور اسے مذہبی جبر کی صورت دے کر نہ تو دینی واخلاقی حدود پامال کرنی چاہییں اور نہ ریاست کے لیے مسائل پیدا کرنے چاہییں۔

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت اسماء بنت مخرّبہ رضی اللہ عنہا

["سیر و سوانح" کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(حضرت اسماء بنت مخرّبہ 'السابقون الأولون' میں سے نہ تھیں، نام کی یکسانیت اور حالات زندگی کے اشتراک کی وجہ سے ان کا ذکر حضرت اسماء بنت سلمہ کے ساتھ کیا جا رہا ہے)

نسب

حضرت اسماء کے والد کا نام مخربہ (مخرمہ: ابن اثیر) تھا۔ نہشل بن دارم ان کے چوتھے، جب کہ تمیم بن مر دسویں جد تھے۔ انھی کے نام سے ان کا قبیلہ بنو تمیم کہلاتا ہے۔ حضرت اسماء اسی نسبت سے تمیمی کہلاتی ہیں۔ ام الجلاس ان کی کنیت اور حنظلیہ لقب تھا۔ کچھ لوگوں نے حضرت اسماء کی ولدیت اسماء بنت عمرو بن مخرّبہ بتائی ہے۔ حضرت اسماء کی والدہ بنو تغلب سے تعلق رکھتی تھیں، عناق بنت جان ان کا نام تھا، شموس بنت وائل ان کی نانی تھیں۔

بیاہ اور اولاد

بنو مخزوم کا ہشام بن مغیرہ اپنی جوانی میں نجران (حران: بلاذری) کے سفر پر گیا اور وہاں اسماء بنت مخرّبہ کو دیکھا جو بیوہ ہو چکی تھیں۔ وہ اسے خوب بھلی لگیں تو بیاہ کر مکہ لے آیا۔ ابو جہل اور حارث کی ولادت ہوئی تو ہشام انتقال کر گیا (ابن حجر)۔ اسماء کے بیوہ ہونے کے بعد ابو جہل کے چچا ابو ربیعہ بن مغیرہ نے ان سے نکاح کر لیا۔

تب حضرت عیاش بن ابو ربیعہ پیدا ہوئے۔ چنانچہ وہ ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام کے ماں شریک سوتیلے بھائی ہوئے۔ ابن عبدالبر اور ابن اثیر کہتے ہیں: ہشام نے اسماء بنت مخرّبہ کو طلاق دی تو وہ ابو ربیعہ عمرو بن مغیرہ کے عقد میں آئیں۔ عبداللہ بن ابو ربیعہ اور ام حجیر حضرت عیاش کے سگے بہن بھائی تھے۔ حضرت اسماء بنت مخرّبہ (مخرمہ)، سلمہ بن مخرّبہ کی بہن، حضرت اسماء بنت سلمہ بن مخرّبہ کی پھوپھی تھیں۔ ابوجہل بن ہشام، حارث بن ہشام، حضرت عیاش بن ابو ربیعہ اور حضرت عبداللہ بن ابو ربیعہ ان کے بیٹے تھے۔

ابن حجر کہتے ہیں: ابن مندہ نے حضرت اسماء بنت سلمہ اور حضرت اسماء بنت مخرّبہ کے حالات زندگی گڈمڈ کر دیے ہیں۔

قریش کا بائیکاٹ اور شعب ابی طالب

۷ رنبوی: قریش کے جور و ستم سے تنگ آئے ہوئے مسلمان آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر حبشہ ہجرت کر گئے تو بھی ان کفار کو چین نہ آیا۔ انھوں نے دو سر کردہ قریشیوں عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو سفیر بنا کر شاہ حبشہ نجاشی کے پاس بھیجا۔ بادشاہ کو چند قیمتی نذرانے دے کر ان سفرا نے گزارش کی کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کر کے آپ کے ہاں پناہ لی ہے، از راہ کرم ہمارے مجرم ہمیں سونپ دیں۔ اس موقع پر حضرت جعفر بن ابو طالب نے اپنی مدلل و موثر تقریر میں اسلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان مشرکوں کے اٹھائے ہوئے شبہات کو خوب زائل کیا تو نجاشی نے مہاجرین کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ سفرا خائب و خاسر ہو کر مکہ پہنچے تو ان کے لیڈروں کا غیظ و غضب بھڑک اٹھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ قتل کرنے کی ٹھانی۔ ایک مشرک منصور بن عکرمہ عبدری نے ان کے حکم پر یہ عہد نامہ تحریر کیا: کوئی شخص خاندان بنو ہاشم میں شادی بیاہ کرے گا، نہ ان سے خرید و فروخت کرے گا۔ ان کو کھانے پینے کا سامان بھی نہ دیا جائے گا، ان کا مکمل مقاطعہ کیا جائے گا، جب تک یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لیے ہمارے حوالے نہیں کر دیتے۔ اس صورت حال میں ابو طالب اپنے کنبے بنو ہاشم کو لے کر مکہ کی پہاڑیوں کے بیچ اپنے موروثی رقبے خیف بنو کنانہ میں منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے بھوک اور افلاس میں تین کٹھن سال گزارے۔ یہ درہ بعد میں شعب ابی طالب کے نام سے مشہور ہوا۔ مشہور ہے کہ معاہدے کی تحریر کعبہ کے دروازے پر یا اس کے اندر لٹکائی گئی، تاہم ایک روایت یہ بھی ہے کہ اسے ابوجہل کی والدہ اسماء بنت مخرّبہ کے پاس رکھوایا گیا۔

قبول اسلام

ابن سعد کہتے ہیں: اسماء بنت مخرّبہ کی وفات مکہ میں حالت کفر ہی میں ہو گئی تھی۔ ابن اثیر کہتے ہیں: مجھے یقین نہیں آتا کہ انھوں نے اسلام قبول کیا ہو، اگر وہ مسلمان ہوتیں تو اپنے بیٹے کی ہجرت سے خوش ہوتیں۔ دوسری روایت کے مطابق وہ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائیں اور حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں انتقال کیا۔ بلاذری اور ابن حجر کہتے ہیں: یہ روایت درست ہے۔

ہجرت مدینہ

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو مدینہ ہجرت کرنے کا اذن دیا تو حضرت اسماء بنت مخرّبہ کے بیٹے حضرت عیاش بن ابو ربیعہ قبا پہنچے تو ان کا سوتیلا بھائی ابو جہل بھی پیچھے پیچھے پہنچ گیا اور کہا کہ والدہ نے جو ابھی تک مسلمان نہ ہوئی تھیں، قسم کھائی ہے کہ وہ سر میں تیل لگائے گی، نہ سائے میں بیٹھے گی جب تک تمھیں دیکھ نہ لے گی۔ یوں بہلا پھسلا کر اس نے انھیں واپسی پر آمادہ کیا، مگر راستے میں رسیوں سے باندھا اور مکہ لا کر قید خانے میں ڈال دیا۔ ان کے محبوس ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اور مکہ میں قید دوسرے مسلمانوں کے لیے دعاے قنوت مانگنا شروع کی۔ حضرت عیاش کی رہائی غزوۂ خندق کے بعد ہوئی۔

عہد رسالت میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مریض کی عیادت کے لیے حضرت ابو ربیعہ کے گھر تشریف لائے۔ ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنت مخرّبہ (مخرّمہ) نے کہا: یا رسول اللہ، مجھے نصیحت نہ فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا: اے ام الجلاس، اپنی بہن سے وہی سلوک کرو جو تم چاہتی ہو کہ وہ تمھارے ساتھ کرے۔ پھر وہ حضرت عیاش کا بیمار بیٹا آپ کے سامنے لائیں، آپ نے اسے دم کیا اور اپنا تھوک اسے لگایا۔ وہ بھی آپ پر تھوکنے لگا تو گھر والوں نے اسے ڈانٹا۔ آپ نے انھیں بچے کو جھڑکنے سے منع فرمایا (کنز العمال، رقم ۳۷۴۵۸۔ جامع المسانید والسنن، ابن کثیر، رقم ۱۲۸۵۷)۔

عہد فاروقی میں

عہد فاروقی میں حضرت ربیع بنت معوّذ کچھ انصاری صحابیات کے ساتھ حضرت اسماء بنت مخرّبہ کے ہاں گئیں جو زمانۂ جاہلیت سے تجارت کرتی تھیں۔ ان کے بیٹے حضرت عیاش بن ابو ربیعہ یمن سے انھیں عطر بھیجتے تھے اور لوگ ان سے وہ عطر خرید کر تحفے تحائف دیا کرتے تھے۔ حضرت ربیع کو دیکھ کر حضرت اسماء بولیں: تو تم اس

شخص (حضرت معوذ بن عفراء) کی بیٹی ہو جس نے اپنے سردار (ابوجہل) کو قتل کیا تھا۔ حضرت ربیع نے جواب دیا: نہ، نہ، میں تو اس بہادر کی سپتری ہوں جس نے اپنے غلام کو مارا تھا۔ حضرت اسماء بنت مخرّبہ نے کہا: مجھ پر حرام ہے کہ تمھیں اپنا ذرا سا عطر بھی بیچوں۔ حضرت ربیع نے جواب دیا: مجھ پر بھی حرام ہے کہ تم سے کچھ بھی خریدوں۔ میں نے کبھی کسی عطر میں تمھارے عطر جیسی بو نہیں پائی۔ بعد میں کہا: میں نے غصے سے ایسا کہہ دیا تھا، واللہ، میں نے اس سے زیادہ اچھی خوشبو کبھی نہیں سونگھی۔

روایت حدیث

حضرت عبداللہ بن عیاش، حضرت ربیع بنت معوذ نے حضرت اسماء بنت مخرّبہ سے حدیث روایت کی۔

وفات

ابن سعد کہتے ہیں: ابوجہل حضرت عیاش کو لے کر ابھی مکہ نہیں پہنچا تھا کہ ان کی والدہ انتقال کر گئیں۔ دوسری روایت کے مطابق ان کی وفات حضرت عیاش کی اسیری کے دوران میں ہوئی۔ تیسری روایت کے مطابق وہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں فوت ہوئیں۔ یہی روایت درست مانی جاتی ہے۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، انساب الاشراف (بلاذری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)۔

حضرت سلمیٰ بنت صخر رضی اللہ عنہا

نام و نسب

حضرت سلمیٰ بنت صخر اپنے لقب ام الخیر سے مشہور ہیں۔ الخیر سے مراد ان کے نام ور اور نیک نام فرزند حضرت ابوبکر ہیں جو خیر البشر بعد الانبیا، یکے از اصحاب عشرۂ مبشرہ اور دور اسلامی کے پہلے خلیفۂ راشد ہیں۔ حضرت سلمیٰ کے دادا کا نام عامر بن کعب اور سکڑ دادا کا سعد بن تیم تھا۔ ان کے شوہر حضرت ابوقحافہ عثمان ان کے والد کے چچا عامر بن عمرو کے بیٹے تھے۔ طبرانی نے حضرت سلمیٰ کے دادا کا نام عامر بن عمرو بن کعب لکھا

ہے۔ یہ زیادہ صحیح ہے، اس سے ان کا اور حضرت ابو قحافہ کا سلسلۂ نسب ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

قبیلہ تیم قریش کا بطن تھا، قبیلہ کے بانی تیم بن عبد مناۃ حضرت ام الخیر کے پانچویں جد ہیں۔ بنو تیم کے مرد امانت داری، حسن معاملہ اور ایفاے عہد میں مشہور تھے اور ان کی عورتیں وقار، اخلاص اور وفاداری کی شہرت رکھتی تھیں۔ بعض مورخین نے حضرت سلمیٰ بنت صخر کی نسبت تمیمی بتائی ہے جو درست نہیں، اسے کتابت کی غلطی ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ بنو تیم کا شجرہ اس طرح ہے: تیم بن عبد مناۃ بن اد بن طابخہ بن الیاس، جب کہ بنو تمیم کا سلسلۂ نسب یوں ہے: تمیم بن مر بن اد بن طابخہ بن الیاس۔ ان دونوں برادر قبائل میں مخاصمت بھی تھی، عبد مناۃ بن اد کے پانچوں بیٹوں تیم، عدی، عوف (عکل)، ثور اور اشیب نے اپنے چچا ضبہ بن اد کے ساتھ مل کر پھلوں کا شیرہ (رُبّ) پیا اور اس میں ہاتھ ڈبو کر اپنے چچیروں تمیم بن مر کے خلاف حلف اٹھایا اور رِباب کہلائے۔ یہ رُبّۃ بمعنی فرقہ کی جمع ہے۔ مطلب ہے کہ وہ الگ الگ گروہ تھے، میثاق باہمی سے یکجا ہو گئے۔

اولاد

حضرت ابو قحافہ کے حضرت سلمیٰ سے کئی بچے ہوئے، لیکن مدت رضاعت ہی میں وفات پا گئے۔ انھوں نے نذر مانی کہ اگلے بچے کا نام عبد الکعبہ رکھیں گی۔ ۵۷۳ء میں حضرت ابو بکر پیدا ہوئے تو حضرت سلمیٰ انھیں بیت اللہ لے گئیں اور اللہ سے دعا کی کہ یہ بچہ موت سے رستگاری پا گیا ہے۔ اب مجھے عطا کر دے۔ وہ زندہ رہے تو عتیق، یعنی موت سے آزادی حاصل کرنے والا ان کا نام ہو گیا۔ حضرت سلمیٰ نے بعد میں آنے والے دو بچوں کے نام مُعتق اور عُتیق رکھے۔ چوتھے کا نام قحافہ تھا جن سے ان کے والد حضرت عثمان نے ابو قحافہ کنیت اختیار کی (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۶)۔ عتیق نام ہونے کی کچھ اور وجوہات بھی بتائی گئی ہیں۔ لیث بن سعد اور عمرو بن علی کہتے ہیں: حضرت ابو بکر کا لقب عتیق اس لیے پڑا، کیونکہ وہ خوب رو اور باوقار تھے (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۴-۵۔ مجمع الزوائد: ۱۴۲۹۲)۔ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں: (ایک بار) ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا: اللہ نے آپ کو دوزخ سے آزاد کر دیا ہے۔ اس دن سے ان کا نام عتیق (آزاد کردہ) ہو گیا (ترمذی، رقم ۳۶۷۹۔ مستدرک حاکم، رقم ۳۵۵۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۸۶۴)۔ حضرت عائشہ ہی کی دوسری روایت ہے: حضرت ابو بکر بارگاہ نبوی میں آتے دکھائی دیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آگ سے آزاد کیا ہوا دیکھ کر مسرت پانا چاہتا ہے، وہ ابو بکر کو دیکھ لے (مستدرک حاکم، رقم ۴۴۰۴۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۹۳۸۴۔ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۴۸۹۶۔ مسند بزار، رقم ۲۲۱۳)۔ ترمذی نے اپنی روایت کو

غریب قرار دیا ہے اور ذہبی نے مستدرک کی روایتوں کو ضعیف بتایا ہے۔

حضرت ابوبکر کا نام عتیق تو تھا ہی، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ عتیق سے مستنبط اور معانی بھی عطا کر دیے، اس طرح یہ نام زیادہ خوب صورت اور پر اثر ہو گیا۔

قبول اسلام

حضرت سلمیٰ بنت صخر بعثت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت ابوبکر سے دوستی تھی اور ان کے گھر آپ کا آنا جانا رہتا تھا۔

نبوت کے تیسرے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو قرآن حکیم سنانا شروع کیا۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے: اسی برس جب اہل ایمان کی تعداد اڑتیس ہو گئی تو حضرت ابوبکر نے ایمان کا اظہار کرنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ آپ مسلمانوں کو لے کر بیت اللہ کے گرد پھیل گئے اور حضرت ابوبکر نے کھڑے ہو کر اہل مکہ کو اللہ ورسول کے اتباع کی دعوت دینا شروع کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مشرکین ان پر پل پڑے، انھیں گرا کر پیروں تلے روندا۔ عتبہ بن ربیعہ نے اپنی بھاری جوتی اتار لی اور حضرت ابوبکر کو پیٹنے لگا، ان کے پیٹ پر چڑھ کر جوتے کے کنارے سے ان کے چہرے پر اتنی ضربیں لگائیں کہ منہ سوج کر کپا ہو گیا اور ناک اس میں چھپ گئی۔ خانۂ کعبہ میں موجود دوسرے مسلمانوں پر بھی تشدد کیا گیا۔

حضرت ابوبکر کے قبیلہ بنو تیم کے لوگوں کو پتا چلا تو وہ دوڑے آئے اور انھیں عتبہ اور اس کے ساتھیوں سے چھڑایا۔ حضرت ابوبکر ادھ موئے پڑے تھے۔ اہل قبیلہ کو یقین ہو گیا کہ وہ جاں بر نہ ہو سکیں گے، اس لیے انھیں کپڑے میں لپیٹ کر گھر لے آئے۔ دن بھر بے ہوش رہنے کے بعد شام کے وقت وہ ہوش میں آئے تو سب سے پہلے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت دریافت کی۔ مشرک اہل قبیلہ طیش میں آ گئے۔ ان کو برا بھلا کہا اور گالی گلوچ کر کے چلتے بنے۔ حضرت ابوبکر کو ان کی والدہ نے کچھ کھانے پینے کو کہا تو انھوں نے کہا: پہلے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتائیں۔ والدہ نے کہا: مجھے علم نہیں۔ انھوں نے کہا: تو عمر کی بہن۔ ام جمیل فاطمہ بنت خطاب سے پوچھ کر آئیں۔ ام جمیل خود آئیں اور بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے دار ارقم میں ہیں۔ حضرت ابوبکر نے کہا: میں آپ سے ملے بغیر کچھ نہ کھاؤں گا۔ جب رات کا اندھیرا ہوا اور لوگ گھروں میں ٹک گئے تو حضرت ام الخیر اور حضرت ام جمیل حضرت ابوبکر کو سہارا دے کر دار ارقم لے آئیں۔ حضرت ابوبکر کو دیکھ کر آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ آپ نے جھک کر ان کا بوسہ لیا۔

حضرت ابو بکر نے کہا: یارسول اللہ، مجھے اور تو نہیں، بس چہرے کی تکلیف ہے۔ جو عتبہ فاسق نے اس کا حال کیا ہے۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی والدہ حضرت ام الخیر سلمیٰ کے لیے نار جہنم سے چھٹکارے کی دعا کرنے کی درخواست بھی کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی جو فوراً قبول ہوئی اور حضرت سلمیٰ اسی وقت دار ارقم ہی میں ایمان لے آئیں۔ اسی دن آپ کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ تب تک ایمان لانے والے انتالیس صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دار ارقم میں ایک ماہ مقیم رہے (البدایۃ)۔

حضرت ابو الخیر سلمیٰ اولیں مسلمانوں میں شامل تھیں۔ انھوں نے ۵ر نبوی (۶۱۴ء) میں دار ارقم میں حاضر ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ تاہم ابن ہشام، ابن کثیر اور ذہبی نے اپنی اپنی ترتیب کردہ 'السابقون الأولون' کی فہارس میں ان کا نام شامل نہیں کیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں: صحابہ میں سے حضرت ابو بکر، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عمار اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی مائیں ایمان لائیں (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۵۸۴)۔ ایک روایت کے مطابق اس فہرست میں حضرت ابو بکر کی والدہ اول شمار ہوتی ہیں۔ حضرت عثمان کی والدہ حضرت اروی بنت کریز ہجرت مدینہ کے بعد اسلام لائیں۔ حضرت طلحہ کی والدہ حضرت صعبہ بنت حضرمی تاخیر سے مسلمان ہوئیں۔ حضرت زبیر کی والدہ حضرت صفیہ بنت عبد المطلب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ غالب امکان ہے کہ وہ اپنے بھائی حضرت حمزہ کے بعد ایمان لائیں۔ حضرت عمار کی والدہ حضرت سمیہ 'السابقون الأولون' میں سے تھیں۔ انھوں نے بھی دار ارقم میں حاضر ہو کر بیعت ایمان کی۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی والدہ حضرت شفا بنت عوف ہجرت مدینہ سے قبل دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔

مدینہ میں

۱۳ر نبوی: بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ میں انصار نے نصرت دین کا عہد کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ام الخیر سلمیٰ بھی مدینہ روانہ ہو گئیں۔ انھوں نے اپنی باقی زندگی مدینہ میں گزاری اور تمام حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری وقت تک ان سے راضی تھے۔ حضرت ابو بکر واحد خلیفہ ہوئے جنھوں نے والدین کی زندگی میں وفات پائی۔ ان کے ماں باپ،

دونوں نے بیٹے کی میراث پائی، مگر حضرت ابوقحافہ نے اپنا حصہ حضرت ابوبکر کی اولاد کو ہبہ کر دیا۔

وفات

حضرت ابوالخیر سلمیٰ حضرت ابوبکر کے بعد زیادہ نہ جی سکیں۔ ان کی رحلت کے کچھ ہی ماہ بعد انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ سن وفات ۱۳ھ (۶۳۴ء) ہے۔ ان کے شوہر اور حضرت ابوبکر کے والد حضرت ابوقحافہ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا اور ۱۴ھ میں ستانویں برس کی عمر میں مکہ میں انتقال کیا۔

مطالعۂ مزید: اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، السیرۃ النبویۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)۔

کوکب شہزاد

حضرت لوط کی قوم پر عذاب کیوں؟

حضرت لوط علیہ السلام کا تعلق اُر کے علاقے سے تھا۔ حضرت ابراہیم حضرت لوط علیہ السلام کے چچا تھے۔ حضرت ابراہیم کی قوم مشرک قوم تھی۔ وہ بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ان کے والد بت بناتے تھے اور ان کی عبادت بھی کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئیں اور بت پرستی چھوڑ دیں، لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ ایک اللہ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی اذیت دی اور انھیں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کی تو ان کے ساتھ ان کے بھتیجے جو ایمان لا چکے تھے، انھوں نے بھی ان کے ساتھ ہجرت کی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو بھی نبوت کے منصب پر فائز کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ سدوم کے علاقے میں جا کر آباد ہو جائیں اور ایک اللہ کا حکم مانیں۔

حضرت لوط علیہ السلام اپنی قوم کے لوگوں کو ایک خدا کی عبادت پر ایمان رکھنے کے لیے نصیحت کرتے تھے اور قیامت کے دن اپنے ہر عمل کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس دلاتے تھے۔

شیطان بنی آدم سے دشمنی کی آگ میں جلتا رہتا ہے اور انسانوں کو گم راہ کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتا۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج دیا ہوا ہے کہ جس انسان کی وجہ سے تم نے مجھے اپنی قربت سے دور کیا، اسی انسان کو میں گم راہ کروں گا اور وہ دوزخ جس میں تو مجھے ڈالے گا، اسی دوزخ کو میں آدم کی اولاد سے بھر دوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اچھے اور نیک بندے تیرے چنگل میں نہیں آئیں گے۔ میں ان کی ہدایت

کے لیے اپنے نبی بھیجوں گا اور جو اس کے باوجود میری نافرمانی کریں گے تو میں انھیں بہت سخت سزا دوں گا اور جو میرے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے، انھیں میں ایسی ایسی نعمتیں دوں گا جن کا وہ اس دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اب بنی آدم اور شیطان کے درمیان قیامت تک کش مکش جاری ہے اور بنی آدم کو اس کش مکش میں جیتنا ہے اور اللہ کی ابدی نعمتوں کا مستحق بننا ہے۔

حضرت لوط کی قوم میں شیطان نے بدفعلی کو بڑا پر کشش بنا دیا تھا۔ مرد مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو فطری طریقہ بنایا تھا، یعنی بیویوں کے ذریعے سے اپنے جذبات کو پورا کرنا اور بیویوں کے ذریعے سے اولاد پیدا کرنا، اسے انھوں نے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس کچھ فرشتے لڑکوں کی صورت میں آئے۔ حضرت ابراہیم نے انھیں اپنا مہمان سمجھا اور ان کے لیے ایک بچھڑا بھون کر لے آئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ تو باوجود اصرار کے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے تو انھیں خوف محسوس ہوا۔ فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو بتایا کہ ہم آپ کو بیٹے کی خوش خبری دینے کے لیے آئے ہیں، (یعنی حضرت اسحٰق کی)۔ دروازے کی اوٹ میں حضرت سارہ (حضرت ابراہیم کی دوسری بیوی) کھڑی تھیں۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ میں بیٹے کو جنم دوں گی تو خوشی کے مارے اپنے چہرے پر ہاتھ مارنے لگیں اور کہنے لگیں کہ ہائے، میں بڑھیا بچہ جنوں گی، جب کہ میں بانجھ ہوں اور میرا شوہر بوڑھا ہو چکا ہے اور اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔

حضرت ابراہیم نے ان سے کہا کہ تم اصل میں کس مشن پر آئے ہو، کیونکہ بیٹے کی خوش خبری دینے کے لیے اتنے فرشتوں کا آنا ضروری نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم کو اندیشہ تھا کہ ضرور ان کو لوط کی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے، کیونکہ وہ بہت بری گندگی میں پڑ چکے ہیں اور بار بار منع کرنے کے باوجود باز نہیں آتے۔

حضرت ابراہیم کو جب یقین دہانی ہو گئی کہ یہ فرشتے حضرت لوط کی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹانے آئے ہیں تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے مجادلہ کرنا شروع کر دیا کہ اے اللہ، آپ لوط کی قوم پر عذاب نہ بھیجیں۔

بائیبل میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے بحث و تکرار کی کہ اے اللہ، آپ سدوم کی قوم، یعنی حضرت لوط کی قوم پر عذاب نہ بھیجیں، ہو سکتا ہے ان میں پچاس لوگ بہتر ہوں۔ اس گندگی میں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابراہیم اگر تو لوط کی قوم میں سے پچاس لوگ بھی اچھے نکال دے تو میں ان پر عذاب نہیں دوں گا۔

حضرت ابراہیم نے جائزہ لیا تو پچاس لوگ بھی ایسے نہیں تھے جو اس کام سے پاک ہوں۔ حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے مجادلہ کیا کہ اللہ تعالیٰ اگر میں چالیس لوگ پاک کردار نکال لوں تب تو آپ ان پر عذاب نہیں بھیجیں گے ؟ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ ابراہیم بہت ہی فرماں بردار اور اللہ تعالیٰ سے کوئی سوال کیے بغیر ہر آزمایش پر پورے اترے۔

بائیبل میں ہے:

''تب وہ مرد (فرشتے) ابراہیم کے پاس سے سدوم کی طرف گئے۔ پر ابراہیم خداوند کے سامنے ہی کھڑا رہا اور اس کے سامنے جا کر اس سے کہا کہ کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ اگر پچاس راست باز آدمی اس شہر میں ہوں گے تو کیا وہ بھی سب کے ساتھ ہلاک ہوں گے اور ان پچاس راست بازوں کی خاطر اگر وہ وہاں پر ہیں کیا وہ بھی ان پچاس کے ساتھ ہلاک ہوں گے ؟ اور ان پچاس راست بازوں کی خاطر اگر وہ وہاں پر ہیں تو کیا تو ان کے مقام کو چھوڑ نہ دے گا؟ ایسا نہ کرنا۔ یہ تجھ سے بعید ہے کہ تو نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک جو ہے وہ بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ تو جو تمام دنیا کا حاکم ہے، کیا راستی سے کام نہ کرے گا؟ اور خداوند نے اسے کہا کہ اگر میں سدوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز پاؤں تو میں ان کی خاطر تمام مقام کو چھوڑ دوں گا۔ اور ابراہیم نے جواب دے کر کہا، دیکھ میں نے اپنے مالک کے سامنے بولنا شروع کیا۔ اگر میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں سے پانچ کم ہوں۔ کیا پانچ کم ہونے کی وجہ سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اور اس نے کہا کہ میں پینتالیس پاؤں تو اسے ہلاک نہیں کروں گا۔ اور پھر اس نے اس سے کہا کہ اگر وہاں چالیس پائے جائیں ؟ اس نے کہا کہ میں چالیس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا اے خدا اگر میں کچھ بولوں تو خفا نہ ہونا۔ شاید وہاں تیس پائے جائیں۔ اللہ نے جواب دیا کہ اگر میں وہاں تیس پاؤں تو میں یہ نہ کروں گا۔ ابراہیم نے کہا کہ میں نے اپنے مالک کے سامنے گستاخی کی ہے۔ اگر وہاں بیس پائے جائیں ؟ وہ بولا میں بیس کی خاطر اسے نیست نہ کروں گا۔ تب اس نے کہا خداوند ناراض نہ ہونا۔ اگر میں فقط ایک دفعہ اور عرض کروں کہ اگر وہاں دس پائے جائیں ؟ خدا بولا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہ کروں گا۔ اور جب خداوند ابراہیم سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابراہیم اپنے مسکن کو پھرا۔'' (پیدایش ۱۸: ۲۲-۳۳)

یعنی حضرت ابراہیم کو حضرت لوط کی قوم میں دس لوگ بھی ایسے نہ ملے جو اس غلاظت سے پاک ہوتے۔ فرشتے خوب صورت لڑکوں کی صورت میں حضرت لوط کی قوم کی طرف آئے۔ قوم کے لوگوں کو جب پتا چلا تو وہ خوشی خوشی حضرت لوط کی طرف چل پڑے۔ حضرت لوط نے جب اپنی قوم کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اس کے

مہمانوں پر جھپٹنے آ رہے ہیں تو وہ نہایت آزردہ ہوئے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو ان کی قوم پر عذاب لے کر آئے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ. يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمۡ اٰتِيۡهِمۡ عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُوۡدٍ. وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ. وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِ ؕ وَمِنۡ قَبۡلُ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ هٰۤؤُلَاۤءِ بَنَاتِىۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَـكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِىۡ ضَيۡفِىۡ ؕ اَلَيۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡدٌ. قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَـنَا فِىۡ بَنٰتِكَ مِنۡ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِيۡدُ. قَالَ لَوۡ اَنَّ لِىۡ بِكُمۡ قُوَّةً اَوۡ اٰوِىۡۤ اِلٰى رُكۡنٍ شَدِيۡدٍ. قَالُوۡا يٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنۡ يَّصِلُوۡۤا اِلَيۡكَ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ وَلَا يَلۡتَفِتۡ مِنۡكُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيۡبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمۡ ؕ اِنَّ مَوۡعِدَهُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَيۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِيۡبٍ. فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ. مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِىَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ.

(ہود ۱۱: ۷۵-۸۳)

”حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا بردبار، بڑا دردمند اور اپنے پروردگار کی طرف بڑا دھیان رکھنے والا تھا۔۔۔ ابراہیم، یہ بحث چھوڑو، تمھارے پروردگار کا حکم ہو چکا ہے اور اب اِن لوگوں پر وہ عذاب آنے والا ہے جو لوٹایا نہیں جاتا۔ (اِس کے بعد جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو اُن کے آنے سے وہ بہت رنجیدہ اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ یہ تو بڑی مصیبت کا دن ہے۔ اُس کی قوم کے لوگ (یہ دیکھ کر کہ خوب رو لڑکے آئے ہیں)، بے اختیار دوڑتے ہوئے اُس کے پاس آ پہنچے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ اِس لیے خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: تمھیں معلوم ہی ہے کہ تمھاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔ لوط نے کہا: اے کاش، میرے پاس تم سے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے سکتا۔ فرشتوں نے کہا: اے لوط، ہم تمھارے

پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (مطمئن رہو)، یہ
تمھارے قریب بھی نہیں آسکیں گے۔ سو اپنے
اہل وعیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ اور تم
میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ تمھاری بیوی
نہیں، اِس لیے کہ اُس پر وہی کچھ گزرنے والا ہے جو
اِن لوگوں پر گزرنا ہے۔ اِن (پر عذاب) کے لیے
صبح کا وقت مقرر ہے۔ (تم پریشان کیوں ہوتے
ہو)؟ کیا صبح قریب نہیں ہے؟ پھر جب ہمارا حکم
آپہنچا تو ہم نے اُس بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور
اُس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے، تہ بر تہ، جو
تمھارے پروردگار کے ہاں نشان لگائے ہوئے تھے
اور وہ اِن ظالموں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھے۔“

لٰہذا اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر عبرت انگیز عذاب بھیجا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر جب ان بستیوں سے ہوتا تو آپ اپنے صحابہ سے فرماتے کہ جلدی جلدی ان بستیوں سے گزرو اور یہاں پڑاؤ نہ ڈالو۔

اس واقعے کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت اس دنیا میں یہ بیماری بہت پھیل رہی ہے۔ بعض ملک تو اسے قانونی شکل دے رہے ہیں۔ ان سب کو، خاص طور پر اسلامی ملکوں کے رہنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ چند لمحوں کی لذت حاصل کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے عذاب کو دعوت دے رہے ہیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟

معاذ بن نور

خدا اور الحاد

[جناب جاوید احمد غامدی کی ویڈیوز کی ٹرانسکرپشن پر مبنی سوال و جواب]

سوال: دین کی بنیاد ہی خدا ہے اور الحاد نے اسی کا انکار کر رکھا ہے۔ ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ الحاد تیزی سے ہمارے ماحول میں پھیل رہا ہے؟

جواب: یہ صحیح بات ہے کہ دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ بندے کو اس چیز کی معرفت حاصل ہو جائے کہ میں بندہ ہوں اور میرا ایک پروردگار ہے۔ میں دنیا میں آپ سے آپ نہیں ہوں، مجھے ایک خالق نے وجود بخشا ہے جو زمین و آسمان کا بادشاہ ہے لہٰذا اسی کو میرا معبود ہونا چاہیے اور اسی کی بادشاہی کا مجھے اعتراف کرنا چاہیے۔

دنیا کی تاریخ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں اس بنیادی حقیقت سے اعراض کرنے والے لوگ رہے ہیں۔ یہ محض آج کا معاملہ نہیں ہے۔ قدیم ترین تاریخ میں الحاد کی سب قسمیں مل جاتی ہیں۔ خدا کو نہ ماننے والے، خدا کے شریک ٹھیرانے والے اور اپنی طرف سے ایک دیومالا بنا کر اس کو دین قرار دینے والے ہر دور میں رہے ہیں۔

انسانی تاریخ کو پڑھنے سے ایک مزید حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کم و بیش چار ہزار سال دنیا میں ایسے گزرے ہیں جس میں شرک کو غالب تہذیب کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ ہوں یا عوام، عارف ہوں یا عامی، سب شرک کا گیت گاتے ہیں اور شرک ہی کی بنیاد پر معاشرے کی تنظیم کرتے ہیں۔ شرک ہی کو منبع الہام سمجھتے ہیں۔ اللہ کے پیغمبروں نے تین چار ہزار سال تک اس کے خلاف جدوجہد کی ہے۔

توحید کا جیسا کچھ علمی غلبہ پچھلے ہزار سال میں رہا ہے، یہ سیدنا مسیح علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوا ہے۔ ’’Age of Civilization‘‘ (کے مصنف) ول ڈیورنٹ کے الفاظ میں (ان ہزار سال کو) عصر الایمان (Age of Faith) کہا گیا۔ ایک طرف مقدس رومی سلطنت قائم ہو گئی اور دوسری طرف مسلمانوں نے اس وقت کی متمدن دنیا پر عمومی سیاسی غلبہ قائم کر دیا۔ سیاسی غلبہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس میں لوگوں کے پاس کم موقع ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات بلند آہنگ انداز میں کہہ سکیں۔ موجودہ زمانے میں لوگوں کو اپنی بات کہنے کی آزادی حاصل ہو گئی ہے تو آپ کو یہ بات زیادہ محسوس ہونے لگ گئی ہے۔

میرے نزدیک ہمیشہ ہی سے الحاد کا سبب انسان کی یہ غلط روی رہتی ہے کہ وہ کسی چیز کا جب اسیر ہو جاتا ہے تو اس کو اس کے حدود میں رکھنے کے بجائے بہت وسعت دے دیتا ہے۔ ایک زمانے میں سحر و ساحری، شاعری، ادب اور فلسفے کو یہی حیثیت حاصل رہی ہے، یعنی انسان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو معبود بنا لیتا تھا اور پھر اس کی بنیاد پر پوری دنیا تخلیق کر لیتا تھا۔

موجودہ زمانے میں یہ ہوا ہے کہ مادی دنیا کے قوانین دریافت ہونا شروع ہو گئے۔ ارسطو سے جس سائنس کی ابتدا ہوئی تھی، اس کو انسان نے اپنے کمال پر پہنچا دیا۔ قوانین دریافت ہوئے تو ان کی بنیاد پر نئی نئی ایجادات ہونے لگ گئیں۔ اس سے پہلے مرحلے میں لوگ حیران ہوئے، پھر یہ حیرت بڑھتی چلی گئی، پھر ایک اعتماد پیدا ہونا شروع ہوا کہ شاید اس کائنات کے معما کو ہم نے حل کر لیا ہے یا کر لیں گے۔ اس سے ایسی مرعوبیت سی طاری ہوئی اور ایک فیشن سا بن گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کی بات پرانی اور دقیانوسی بات ہے، یہ دنیا غالباً اب ختم ہو رہی ہے۔

(الحاد کا اس دور میں) ایک بڑا سبب یہ چیز بنی ہے، جب کہ اگر آپ حقیقت کی نگاہ سے دیکھیں تو اس پورے عالم میں اصل راز کیا ہے (اتنی سائنسی ترقی کے بعد) جس کے کم از کم ایک فی صد حصے کو تو اب کھلنا چاہیے۔

وہ راز جہاز یا انٹرنیٹ ایجاد کر لینا نہیں ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ یہ کائنات مادہ ہے۔ جو یہ مخلوقات، اجرام فلکی، کہکشائیں اور سپائرل نیبیولاز جو آپ کو نظر آتے ہیں یہ سب مادے کا ایک عظیم انفجار ہے۔

اس مادے سے حیات پیدا ہو جاتی ہے، یعنی وہی زمین جو بظاہر مردہ نظر آ رہی ہوتی ہے، وہ حیات کا باعث بن جاتی ہے۔ درخت، پودے، پھول اور پھر جراثیموں سے ڈائنوسارز تک بے پناہ مخلوقات جن کو ہم گن ہی نہیں سکتے۔ اور پھر ہم انسانوں کی صورت میں شعور کی ایک دنیا وجود میں آتی ہے، یعنی سمع و بصر، عقل، جمالیات اور اخلاقی وجود۔

یہ تین چیزیں ہیں، دراصل جو مل کر اس کائنات کا راز بنتی ہیں:

آپ حیرت انگیز طریقے سے یہ سنیں گے کہ مادے کو سائنسی طور پر سمجھ لینا کہ یہ کیسے وجود میں آیا ہے اور کسی لیبارٹری میں اسے بہت چھوٹے پیمانے پر ہی وجود میں لے آنا۔

مادے کے ڈھیر موجود ہیں، اس سے حیات پیدا کر لینا یا یہ سمجھ لینا کہ وہ کیا تالیف ہے جس سے حیات پیدا ہوتی ہے۔

اور حیات میں شعور کی کوئی رمق پیدا کر لینا۔

اس راز کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا۔ یہ جیسا تھا ویسا ہی اس وقت موجود ہے، لیکن انسان کی نگاہ اس طرف نہیں پڑتی اور وہ اس مادی دنیا کے کچھ قوانین کی دریافت سے پیدا ہونے والی حیرت انگیز ایجادات کی وجہ سے یہ خیال کرتا ہے کہ ہم کائنات کے معما کو حل کر لیں گے۔

انسان اس خبط میں مبتلا ہو گیا ہے کہ غالباً وہ اس پر قابو پا لے گا۔ اگر کوئی دو قدم اٹھ سکتے تو یہ غلط فہمی کسی حد تک جسٹیفائڈ (justified) تھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ علمی سطح پر الحاد کا باعث یہی غلط فہمی ہے۔

دوسری چیز عمل کی سطح پر ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کے پاس صرف عقل، شعور اور اخلاقی وجود ہی نہیں ہے، بلکہ خواہشات، جذبات اور رغبات بھی ہیں اور پھر ان کو پورا کرنے کے مواقع ہیں جو انسان کو ملتے ہیں۔ دور حاضر میں یہ مواقع بہت بڑھ گئے ہیں اور چونکہ سیاسی غلبہ مذہبی لوگوں کا نہیں رہا تو اس وجہ سے آزادی کی ایک فضا بھی ہے۔ اس فضا میں اپنی خواہشات کی اسیری سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ مذہب اور خدا کی بات سن کر مجھے بہت سی ایسی چیزوں کو ترک کرنا پڑے گا۔ تو انسان کے ہاں آزادی کی قدر اتنا غلبہ پا چکی ہے کہ جس طرح پہلی چیز میں وہ غلط فہمی کا شکار ہوا ہے، یہاں انتہا پسندی کا شکار ہوا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ کسی چیز کو بھی جو ذرا پابندی عائد کرے اور اس کی معاشرت میں دخیل ہو جائے، قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک علم اور عمل کی سطح پر (بالترتیب) یہ دو چیزیں ہیں جو خدا سے دوری کا باعث بنتی ہیں۔ اور ایک چیز جب فیشن بن جاتی ہے تو انسان خیال کرتا ہے کہ اسی میں جینے سے دنیا میں اس کو اچھا سمجھا جائے گا۔

اس موقع پر ضروری ہے کہ سب انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچایا جائے۔ ہم مسلمانوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب اس کے اپنے الفاظ میں بغیر کسی ادنیٰ تبدیلی اور تغیر کے موجود ہے۔ ہم اس کو پہنچائیں گے تو یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حقیقت کا بیان ہے، یہ خدا کی سچی معرفت کا ذریعہ ہے۔ مجھے پوری امید

ہے کہ ہم اپنی نئی نسلوں کو اللہ کی کتاب پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو وہ سچی معرفت پیدا ہو گی جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔[1]

لالچ کیا ہے؟

سوال: لالچ کیا ہے؟

جواب: انسان کے اندر جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کی ہیں، ان میں ہر چیز کو آگے بڑھ کر پانے، زیادہ پانے کا داعیہ بھی رکھا ہے۔ یہ زیادہ پانا، اسی کو 'اِستِکثار' سے قرآن میں تعبیر کیا گیا ہے۔ زیادہ پانے کی جدوجہد انسان مال کے معاملے میں بھی کرتا ہے، علم کے معاملے میں بھی کرتا ہے، اگر اس کے اندر ایک حوصلہ مند شخصیت ہو تو بعض اوقات اقتدار کو پانے کے لیے بھی کرتا ہے۔ یہ چیز اپنی ذات میں کوئی قابل مذمت چیز نہیں ہے۔

اسی کا ایک پہلو وہ بھی ہے جس میں لوگوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ جنت کو پانے کے لیے بھی وہ کم پر اکتفا نہ کریں، بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچنے کی جدوجہد کریں۔

قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ 'تنافس' ہے۔ جنت کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ'[2]، یعنی وہ لوگ جو ایک دوسرے سے دوڑ لگا کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں، وہ کوشش کریں کہ جنت کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زیادہ پانے کی جدوجہد

۱-https://www.youtube.com/watch?v=R96rnqFq-9I

۲- المطففین ۸۳: ۲۲-۲۶۔ 'اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ. عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ. تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ. يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ. خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ' (یہ فرماں بردار (وہاں) نعمتوں میں گھرے ہوں گے، تختوں پر بیٹھے سیر دیکھتے۔ اِن کے اِس عیش کی تازگی تم اِن کے چہروں پر دیکھو گے۔ اِنھیں سر بندِ مے ناب پلائی جائے گی۔ جس پر مشک کی مہر لگی ہو گی۔ یہ چیز ہے کہ جس کی طلب میں طالبوں کو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے سرگرم ہونا چاہیے)۔

کرنا اپنی ذات میں کوئی بری چیز نہیں ہے۔ یہ چیز بری اس وقت بنتی ہے، جب انسان کو جن اخلاقی اقدار کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، ان کا لحاظ کیے بغیر وہ آگے بڑھنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ لالچ، حرص یا اس نوعیت کے برے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ گویا ایک چیز جب صحیح حدود میں ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پسند بھی کرتے ہیں، اس کی تحسین بھی کرتے ہیں، بلکہ اس کی ترغیب دیتے ہیں۔

چونکہ انسان کو اخلاقی تقاضوں کا شعور دیا گیا ہے، اس میں ایک بڑا تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان آگے بڑھنے کی جدوجہد کا ہدف اس دنیا میں جنت کو بنائے۔ جنت کو ہدف بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق کی پاکیزگی کے ساتھ آگے بڑھے۔ یعنی خیر، نیکی، انفاق، اللہ کے دین کی خدمت، اپنے اعزہ، اقربا اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے میں آگے بڑھے۔ یہ ساری چیزیں بڑی مطلوب و محمود اور ہر لحاظ سے قابل تحسین ہیں۔ لیکن اگر انسان دوسروں سے مال چھیننے میں آگے بڑھ رہا ہے، ان کی ٹانگیں کھینچنے اور نقصان پہنچانے میں آگے بڑھ رہا ہے یا یہ کہ جو کچھ اس کو مل گیا ہے، اس پر شکرگزار ہو کر آگے بڑھنے کے بجائے ناشکری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہو تو ایک ہی عمل جو اپنی ذات میں کوئی برا عمل نہیں تھا وہ پھر قابل مذمت ہو جاتا ہے، یعنی ایک جگہ یہ ترغیب دی ہے کہ آگے بڑھو اور دوسری جگہ یہ بیان کیا ہے کہ 'اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ'[۳]۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی جدوجہد نے تمھیں ہلاک کر ڈالا۔

لٰہذا یہ دونوں چیزیں، (یعنی تکثیر اور تنافس) انسان کے اخلاقی وجود سے ماپی جاتی ہیں۔ اگر تو وہ اعلیٰ اخلاقیات کو سامنے رکھ کر آگے بڑھ رہا ہے تو محمود اور اگر وہ اخلاق کے آلودہ پہلوؤں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھ رہا ہے تو قابل مذمت۔

۳۔ التکاثر ۱۰۲: ۱-۸۔ 'اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ. حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ. كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ. ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ. كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِ. لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ. ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ. ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ.' (بہت پانے اور اُس میں دوسروں سے بڑھ جانے کی حرص نے تمھیں غفلت میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ (نہیں، یہ کچھ نہیں لوگو)، ہرگز نہیں، تم جلد جان لوگے۔ پھر سنو، (یہ کچھ نہیں)، ہرگز نہیں، تم جلد جان لوگے۔ تم اِس طرح غافل نہیں ہو سکتے تھے، ہرگز نہیں، اگر تم یقین سے جانتے کہ دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر جانتے کہ تم اُسے یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے۔ پھر دنیا کی سب راحتوں کے بارے میں اُس دن تم سے ضرور پوچھا جائے گا)۔

یہ اعلیٰ اخلاق اگر پیش نظر ہے تو ہر چیز جس میں آپ آگے بڑھ رہے ہیں، وہ اللہ کا فضل تلاش کرنا ہے، وہ خیر کو تلاش کرنا ہے، اس کی قرآن نے ترغیب دی ہے۔ نہ دولت کوئی بری چیز ہے، نہ علم اور نہ ہی اقتدار کوئی بری چیز ہے۔ آپ ان کی طرف آگے بڑھیے، لیکن اخلاقی حدود کی سچی پاس داری کے ساتھ آگے بڑھیے۔[۴]

۱- https://youtu.be/eGiCsyxRr2Q?si=MlUks2l2HY-0xciI

شاہد رضا

رمضان کے اثرات

[جناب جاوید احمد غامدی کی تحریروں، آڈیوز اور
ویڈیوز سے اخذ واستفادہ پر مبنی مختصر سوال وجواب]

سوال: ہمارے معاشرے میں رمضان کے اثرات کیوں نہیں پائے جاتے؟

جواب: دین کا مقصد ہی انسان کے اخلاقی وجود کا تزکیہ ہے۔ دین اصلاً یہی چاہتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو شرف عطا فرمایا ہے کہ وہ خیر وشر کا شعور رکھتا ہے؛ خیر کو اپنانے کے لیے آگے بڑھتا ہے، شر سے اجتناب کے لیے اس میں داعیات رکھے گئے ہیں۔ یہی کشمکش ہے جس میں اس کو زندگی بسر کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو ابتلا یا امتحان برپا کیا ہے، وہ اصل میں خیر وشر میں امتیاز اور پھر اس میں خیر کو اختیار کرنے اور شر کو چھوڑنے کا امتحان ہے، لیکن اس معاملے میں، معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں نے شاید نہ دین کو سمجھا ہے اور نہ اس کے مقصد کو۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ خیر وشر کی کش مکش کی دنیا الگ ہے اور عبادات کی یہ دنیا الگ ہے۔ لہٰذا دنیا کی زندگی میں ہمیں جس امتحان میں ڈالا گیا ہے، وہ اصل میں اخلاقی وجود کی تطہیر، اس کے تزکیے اور اس کو پاکیزہ بنانے کا امتحان ہے۔ اگر یہی نہیں ہوا تو پھر یہ روزے جیسی ساری چیزیں بے کار ہو جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ آدمی نے اپنے اوپر بہت سی پابندیاں تو لگا لیں، مگر اس نے جھوٹ بولنا، کم تولنا اور دھوکا دینا نہیں چھوڑا۔ یہ کوئی معمولی الم ناک صورت حال تو نہیں ہے کہ جیسے ہی رمضان کا مہینا آتا ہے، اشیا کی قیمتیں بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں۔ دنیا کا عمومی تجربہ یہ ہے کہ باہر کے ملکوں میں کرسمس کے موقع پر قیمتیں کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور ہر دکان دار یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ہمارا اجتماعی تہوار ہے؛ بہت سے لوگوں نے خریداری کرنی

ہے تو میں اپنی منفعت کو کم کر دوں، لیکن ہمارے ہاں تو عمومی رویہ یہ ہے کہ جیسے ہی رمضان کی آمد شروع ہوتی ہے، قیمتیں بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس موقع پر حکومت سبسڈی دیتی ہے، اپنی طرف سے کچھ مدد کرنے کی کوشش کرتی ہے اور نگرانی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ نگرانی جو خدا کی طرف سے ہونی چاہیے تھی اور جس میں انسان کو اپنے پروردگار کو جواب دہ سمجھ کر اپنی تطہیر اور تزکیے پر متوجہ ہونا چاہیے تھا اور اگر عام دنوں میں کوئی غلطی ہوتی بھی ہے، اس دوران میں اس کو غلطی سے بچنا چاہیے تھا، اس کے عمومی اثرات نظر نہیں آتے۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جتنی بھی عبادات کی نوعیت کی چیزیں ہیں، مثلاً نماز، حج و عمرہ وغیرہ تو بالعموم ان کے فضائل تو بیان کیے جاتے ہیں جن کا تعلق آخرت میں اجر و ثواب سے ہے، دنیا کی زندگی میں اس کے کیا اثرات ہونے چاہییں اور انسان کے اخلاقی وجود پر اس کا کیا اثر ہونا چاہیے، یہ بالعموم ہماری مذہبی گفتگو میں زیر بحث نہیں آتا[1]۔

علما اور عید کا تعین

سوال: علما کے مابین اختلاف کے ہوتے ہوئے مسلمان ایک ہی دن عید کیسے منائیں؟

جواب: اس کا تعین کرنا علما کا کام نہیں، بلکہ سائنس دانوں کا کام ہے۔ جدید سائنس نے انسان کو اس قابل کر دیا ہے کہ اب وہ سیکنڈز کے حساب سے آپ کو بتا سکتی ہے کہ چاند کی پیدایش کب ہو گی۔ اگر آپ سائنس دانوں سے کہیں تو وہ آپ کو چاند کی پیدایش کے لحاظ سے قمری مہینوں کا کیلنڈر بنا کر دے دیتے ہیں، اس لیے علما کی طرف سے عید کے چاند کی تعیین کی اب ضرورت ختم ہو چکی ہے۔ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ہمارے ہاں آخر نمازوں کے اوقات بھی تو سورج کے لحاظ سے ہیں۔ سائنس دانوں نے ہمارے لیے گھڑی ایجاد کر دی ہے۔ اب ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کے بجائے باہر جا کر سورج دیکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو ایک چھڑی گاڑنی پڑتی تھی تاکہ سایے کا اندازہ ہو جائے۔ بتانے کے لیے یہ کہنا پڑتا تھا کہ تمھارے قد کے برابر سایہ ہو جائے تو اس نماز کا وقت ہو جائے گا۔ غروب آفتاب کو بھی باہر نکل کر دیکھنا پڑتا تھا، اس کے سوا کوئی اور

1-https://ghamidi.com/videos/why-ramadan-is-ineffective-in-our-society-1214

طریقہ نہیں تھا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک ٹاٹ کا ٹکڑا مسجد کی دیوار پر ڈال دیا جاتا تھا تاکہ اس کے سایے سے جمعہ کے وقت کا اندازہ ہو جائے، تو اب بھی آپ یہی کرتے ہیں۔ یہ جو پاکستان کی مسجدوں میں نمازوں کے اوقات کا کیلنڈر آویزاں ہے، یہ انگریز بحریہ کا بنایا ہوا ہے۔ انھوں نے آپ کو گھڑی ایجاد کر کے دے دی، اب آپ اطمینان کے ساتھ اس کے ذریعے سے سحری کرتے اور غروب آفتاب کا اندازہ کر کے روزہ کھول لیتے ہیں۔ دیہات میں ہماری مائیں تاروں کو دیکھ کر یہ اندازہ کرتی تھیں کہ سحری کا وقت ہوا ہے یا نہیں۔ چاند دیکھنا علما کا کام ہی نہیں ہے۔ چاند دیکھنا علم فلکیات کا موضوع ہے اور یہ سائنس دانوں کا کام ہے[۲]۔

۲-https://www.youtube.com/watch?v=8FEmmcEeKtI

Monthly
ISHRAQ
Lahore

April 2024
Vol.36 No.4
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ''اشراق'' کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ''اشراق'' کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ''اشراق'' کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ''اشراق'' کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ وتفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق